8407

پانی پت کے قاری

ایک وضاحت : ایک معذرت

13713

حضرت مولفؒ نے زندگی میں کبھی اپنے ارادہ اور اجازت سے تصویر نہیں کھنچوائی۔ غالباً ۱۹۴۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طلبا کی ایک جماعت پانی پت مطالعاتی دورے پر آئی۔ انہوں نے پانی پت کی مساجد و مقابر کے علاوہ وہاں کی تاریخی عمارتوں کی سیر کی اور شہر کی اہم شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ ان طالب علموں میں سے کسی نوجوان نے دوران گفتگو ابا جان کی تصویر اپنے چھوٹے سے بکس کیمرہ سے اتار لی جس کا قبلہ گاہی کو علم نہیں ہوا۔ انہوں نے اس تصویر کی ایک کاپی ہمیں بھجوائی جو میرے کاغذات میں دبی پڑی رہی۔ یہ تصویر نہ صرف یہ کہ بہت چھوٹی تھی بلکہ اتنی مدھم اور دھندلی تھی کہ نہ اس کی کاپیاں بنوائی جا سکتی تھیں' نہ اسے بڑا کرایا جا سکتا تھا۔ خود میں نے کئی بار کوشش کی کہ ابا جان کی لاعلمی میں ان کی ایک تصویر اپنے کیمرہ سے بنا لوں لیکن وہ ہمیشہ ہی میرے ارادے کو بھانپ گئے اور مجھے ڈانٹ دیا۔

۱۹۵۳ء میں ان کے انتقال کے بعد میں نے تکفین سے پہلے ان کی چند تصاویر اتاریں جو میری البم میں محفوظ رہیں۔ ۱۹۸۷ء میں پتا چلا کہ لاہور میں ایک فنکار ہیں جو دھندلی تصاویر سے برش اور پنسل کے عمل سے صاف تصاویر بنا دیتے ہیں۔ میں نے ان سے رجوع کیا اور انہیں وہ پرانی تصویر بھی دکھائی اور اپنی بنائی ہوئی تصاویر بھی۔ انہوں نے اپنی مہارت اور ان تصاویر کی مدد سے ابا جانؒ کی ایک رنگین شبیہ بنا دی جو حیرت انگیز طور پر اصل سے مشابہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ ابا جانؒ کا چہرہ زیادہ پر گوشت اور زیادہ وجیہ تھا۔ جب میں نے مصور موصوف کو اس طرف توجہ دلائی تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ انتقال کے بعد جو یک پہلو (Side Pose) میں

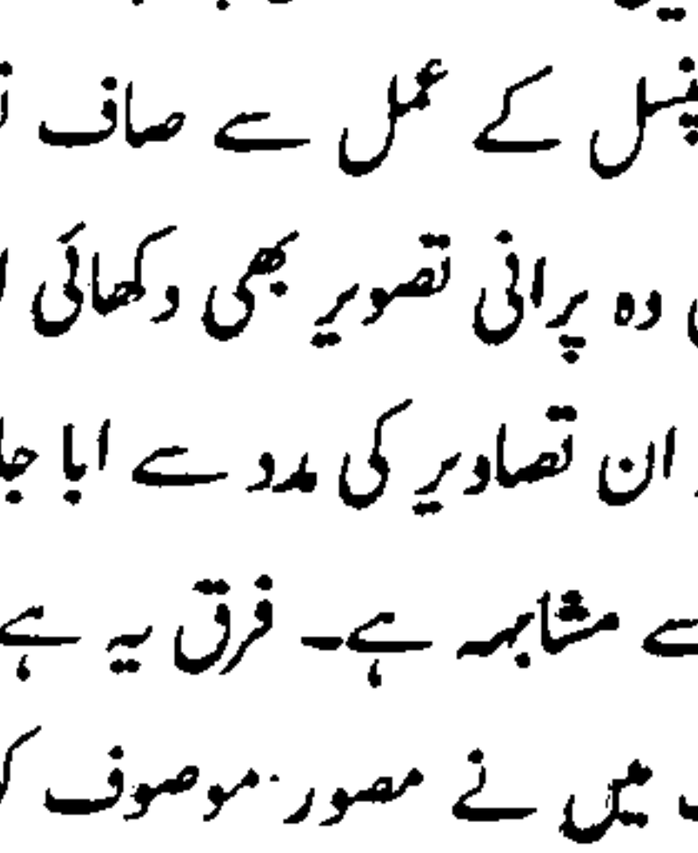

نے اتارے تھے ان سے اس سے بہتر تصویر کا بننا ممکن نہ تھا۔ بہرحال یہ تصویر ابا جانؒ سے اس قدر مشابہ ہے کہ جن لوگوں نے انہیں ایک بار بھی دیکھا تھا وہ فوراً پہچان جاتے ہیں۔

اس کتاب میں تصویر کی شمولیت کے متعلق میں تذبذب میں رہا کہ مناسب رہے گی یا نہیں۔ ایک طرف تصویر کی حرمت کا احساس تھا' دوسری طرف محبت پسری کی فطری کمزوری مجبور کر رہی تھی۔ آخر ذہن نے یہ جواز تراشا کہ آج کے دور میں تصویر ایک طرف تو لازمہ زندگی بن گئی ہے کہ حرمین شریفین کی زیارت اور ادائیگی و حج و عمرہ کے لیے جاتے ہوئے بھی اس سے مفر نہیں اور ہر شخص خواہ کتنا ہی ثقہ اور پابند شریعت ہو' پاسپورٹ' ویزا اور رجسٹریشن کارڈ کے لیے تصویر کھنچوانے پر مجبور ہے۔ دوسری طرف روزانہ لاکھوں تصاویر چھپتی ہیں اور ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہیں اور کوئی بھی انہیں نہ احترام سے دیکھتا ہے نہ ان کو سنبھال کر رکھتا ہے۔

چونکہ میں اس کتاب کو اپنے خاندان کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک ورثہ اور امانت سمجھتا ہوں اس لیے میں نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ تصویر کو کتاب میں شامل کر دوں۔ اگر میرا یہ فعل میرے ثقہ احباب اور بزرگوں کو نامناسب معلوم ہو تو میں بصد ادب ان سے معذرت خواہ ہوں اور حق تعالیٰ جل شانہ کی وسعت عفو و درگذر سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ایک عقیدت مند بیٹے کی اس غلطی کو معاف فرما دیں گے۔

استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ

بندہ مذنب الضعیف

ایم۔ اے۔ عثمانی

شجرۂ نسب حضرت شیخ الشیوخ امام القراء سرتاج المجودین

مولانا ابو محمد محی الاسلام عثمانی اموی قرشی

عبد مناف، عبدالشمس، امیہ، عفان، امیرالمومنین، ذوالنورین سیدنا عثمانؓ جامع
القرآن عمروؓ، عبداللہ الکبیرؓ (الاول)، عبدالعزیزؓ الکبیر (الاول) عبداللہ الثانیؓ

۱ عبد مناف پر آپ کا شجرۂ نسب حضور پرنور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

۲ حضرت عمرو بن حضرت عثمانؓ بن عفان کی کنیت ابو عثمان تھی۔ آپ اپنے والد ماجدؓ اور حضرت اسامہؓ بن حضرت زیدؓ سے اور آپ سے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کے علاوہ حضرت امام علیؓ بن حسینؓ حضرت سعید بن المسیبؒ اور حضرت ابو زنادؒ روایت کرتے ہیں۔ ابن سعد نے آپ کو طبقہ' اولیٰ میں شمار کیا ہے اور کہتے ہیں کہ آپ ثقہ صاحب احادیث تھے اور عجلی کہتے ہیں مدنی ثقہ کبار تابعین سے تھے زہیر بن بکار کہتے ہیں کہ آپ حضرت عثمانؓ کے ان بیٹوں میں' جو آپ کی شہادت کے بعد باقی تھے سب سے بڑے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی صاحبزادی رملہ کا نکاح آپ سے کیا تھا۔ ابن حبان نے آپ کو ثقات میں گنا ہے۔ (تہذیب' جلد ۸' ص ۷۹)

۳ عبداللہ بن عمرو بن حضرت عثمانؓ مطرف کے لقب سے معروف تھے (جس کے معنی ہیں حسین و جمیل و وجیہ) آپ کی والدہ حضرت حفصہ بنت عبداللہ بن عمر فاروقؓ تھیں اور یوں آپ میں عثمانی اور فاروقی خون کی آمیزش ہوگئی اور آپ کے اخلاف کو نسبت مادری سے فاروقی ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔ آپ اپنے والد ماجد اور نانا حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت امام حسینؓ بن علیؓ اور حضرت رافع بن خدیج وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور آپ سے آپ کے فرزند محمد معروف بہ دیباج (جنہیں ابو جعفر المنصور نے شہید کیا) زہری' ابوبکر بن حزم' محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لبیبہ اور ہشام بن سعد حدیث روایت کرتے ہیں۔ آپ نہایت شریف' کریم الاخلاق' سخی اور ممدوح خلائق تھے۔ نسائی کہتے ہیں ثقہ تھے۔ ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور زہیر بن بکار کہتے ہیں کہ فرزدق شاعر آپ ہی کی مدح میں کہتا ہے۔

نمی فارق امک و ابن اروی
اباک فانت منصدع النہار
ھما قمر اسماء و انت نجم
باللیل یدلج کل ساری

یعنی تیری والدہ کو فاروق اعظمؓ نے اور تیرے والد کو اروی کے بیٹے (حضرت عثمانؓ) نے پالا ہے۔ وہ دونوں آسمان کے چاند تھے اور تو ستارہ ہے جس سے اندھیری رات میں ہر راہ رو راستہ پاتا ہے (اروی حضورؐ کی پھوپھی تھیں اور یوں حضرت عثمانؓ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے) امام ابوعبید قاسم بن سلام اور ابن سعد اور ابن یونس کہتے ہیں عبداللہ بن عمرو نے ۹۲ھ میں مصر میں وفات پائی۔ (تہذیب' جلد ۵' ص ۳۳۱)

۴

ابوبکر بن حزم روایت کرتے ہیں کہ ان عبدالعزیز کبیر کو بھی معہ ان کے بیٹے اور دو بھتیجوں کے ابو جعفر المنصور نے شہید کرا دیا اور غالباً ان مظالم سے دل برداشتہ ہو کر ان کے پوتے عبدالرحمٰن الکبیر نے جوار رسول کو چھوڑ کر فارس کے شہر گازرون کی طرف ہجرت کی۔

۶

آل عثمانؓ کی یہ شاخ عبدالرحمٰن گازرونی کے توسط سے ہندوستان وارد ہوئی اور پانی پت اور نواح پانی پت میں آباد ہوئی۔ خواجہ عبدالرحمٰن موصوف سلطان محمود غزنوی کے لشکر میں شرعی حاکم (یا ترکان عثمان کی اصطلاح میں قاضی عسکر) تھے۔

واللہ اعلم بالصواب

خواجہ عبدالرحمٰن الکبیر مدنی ثم الفارسیؒ خواجہ عبدالعزیز ثانیؒ خواجہ ولید، خواجہ خالد، خواجہ عبدالعزیز الثالث سرخسی، مولانا خواجہ عبدالرحمٰنؒ، گازرونی ثم پانی پتی، خواجہ شہاب الدین، خواجہ عبداللہ الثالث، خواجہ عثمان، خواجہ علی، خواجہ ابوبکر، خواجہ محمد، خواجہ اسماعیل، خواجہ عیسیٰ، خواجہ یعقوب، خواجہ محمود،

قطب الاقطاب، خواجہ خواجگان، حضرت خواجہ محمد الملقب بہ مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الدولیا، چشتی صابریؒ

خواجہ ابراہیم، مولانا خواجہ احمد، مولانا خواجہ محفوظ، شیخ حسین عرف منا، مولانا شیخ حبیب اللہ، مولانا مفتی عبدالسمیع، شیخ خلیل اللہ، مولوی شیخ عبدالقدوس، شیخ سعید الدین، شیخ جلال الدین، شیخ محمد عظیم، شیخ غلام شمس الدین، شیخ محمد فخر الدین معروف بہ غلام مجدد، مولوی حافظ بدر السلام، قاضی محمد مفتاح السلام۔

شیخ القراء، امام المجودین مولانا ابو محمد محی الاسلام عثمانی اموی قرشی

پانی پت کے قاری

فہرست

شمار	ترتیب	صفحہ
۱	پانی پت کی قرائت	1
۲	تعارف حضرت مؤلفؒ	18
۳	حافظ شمس الاسلام عثمانی	51
۴	مولوی حافظ نجم الاسلام عثمانی	54
۵	مولوی حافظ بدر الاسلام عثمانی	58
۶	مولوی حافظ اکرام اللہ انصاری	64
۷	قاری ممتاز علی	69
۸	حافظ مرید حسین عثمانی	71
۹	قاری عبداللہ انصاری	73
۱۰	حافظ عبدالرحیم انصاری	75
۱۱	حافظ قاری نور الہدیٰ	76
۱۲	قاری سید فخرالدین	84

۱۳	مولانا قاری فتح محمد صدیقی	89
۱۴	قاری محمد حسن انصاری	90
۱۵	شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی انصاری	92
۱۶	مولوی قاری حافظ حکیم عبدالعلیم انصاری	93
۱۷	قاری حافظ شیخ احسان اللہ صدیقی	98
۱۸	قاری سید قیام الدین	100
۱۹	قاضی قاری صدر الدین انصاری	103
۲۰	مولوی قاری عبدالسلام عباسی	107
۲۱	حافظ قاری محمد یحییٰ عثمانی	108
۲۲	حافظ قاری محمد ابراہیم عثمانی	113
۲۳	قاری پیر عبدالرحمٰن	117
۲۴	حافظ قاری اللہ دیا راجپوت	118
۲۵	قاری حافظ سید محتشم	119

پانی پت کی قرأت

ایم۔ اے۔ عثمانی

پانی پت میں مسلمان ایک مشہور و معروف روایت کے مطابق سلطانِ غازی محمود غزنوی کے زمانہ سے آباد ہیں۔[1] شہر کے وسط میں جو مرکزی جامع مسجد ہوا کرتی تھی اور جس میں شیخ الشیوخ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن محدثؒ اور مولانا اکرام اللہ انصاریؒ درس دیا کرتے تھے اس کی مرکزی محراب میں سنگ مرمر کا ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر بعہد غازی سلطان محمود غزنوی اس کے مسجد بنائے جانے کی تاریخ درج تھی۔ پانی پت شروع ہی سے علم و عرفان کا مرکز بن گیا چونکہ اسے علماء اور صوفیاء نے اپنا مستقر بنا لیا۔ جائے وقوع کے اعتبار سے پانی پت کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ دلی کے قریب ہوتے ہوئے بھی درباری جوڑ توڑ سے پاک' سادہ سا قصباتی ماحول تھا جو اہل علم اور اہل حال کے لیے سازگار تھا۔

ا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک سکالر ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب نے حضرت قاضی محمد ثناء اللہ محدث مفسرؒ پر ایک مبسوط مقالہ اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھیسس کے طور پر لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے اجداد" مطبوعہ رسالہ "الحق" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ عثمانیوں کا سلطان محمود غزنوی کے دور میں اور ان کے ہمراہ پانی پت آ کر آباد ہو جانا جبکہ یہ تمام علاقہ متعصب ہندوؤں کے زیر نگین تھا' ناممکن نظر آتا ہے۔ ان کے خیال میں سلطان محمود غزنوی کی جگہ سلطان قطب الدین ایبک کا نام ہونا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک قلمی شجرہ کا حوالہ بطور شہادت پیش کیا ہے۔

اس شہر کے فضلاء ایسے بے نفس گزرے ہیں کہ باوجود ان کے فضل و کمال کے ان کی ذات کے بارے میں یا ان کے کام کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ کچھ انفرادی کوششیں ہیں اور بس۔ کوئی مبسوط تاریخ یا دستاویز نہیں ملتی' مثلاً سلسلہ چشت کی صابری شاخ حضرت شمس الدین ترک شاہ ولایتؒ اور آپ کے خلیفہ حضرت مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الاولیاؒ سے چلتی ہے۔ لیکن بعض مستند اور مبسوط تذکروں میں حضرت جلالؒ کا نام بھی صحیح درج نہیں ہے۔ احوال تو دور کی بات ہے' حالانکہ حضرت کے خلیفہ مخدوم شیخ عبدالحق ردولویؒ اور ان کے خلفاء مثلاً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حالات و احوال پر مستقل تصانیف ہیں۔ اور تذکرۃ الاولیاء میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔

پانی پت ایک عرصہ دراز تک قرأت قرآن کا مرکز رہا اور پانی پت کی قرأت پورے برصغیر میں بلکہ متعدد پڑوسی ممالک میں مشہور و متعارف تھی لیکن میری نظر سے شیوخ پانی پت کا کوئی تذکرہ نہیں گزرا۔ قبلہ والد صاحبؒ نے جو خود اپنے وقت میں قرأت کے امام تھے اس کمی کو غالباً محسوس کیا اور ایک مبسوط تذکرہ کے لیے مواد جمع کرنا شروع کیا لیکن کچھ دستور شہر اور کچھ عدم تعاون کے سبب کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ مزید یہ کہ قبلہ گاہیؒ خود اس زمانے میں متعدد زیادہ اہم تصنیفی اور تالیفی کام کر رہے تھے' اس لیے اس طرف ایسی توجہ غالباً نہیں فرما سکے جیسی توجہ کا یہ کام متقاضی تھا۔ ان کی سب سے اہم مصروفیت تو تفسیر مظہری کی تسوید اور حیات نو تھی۔ پھر شرح سبعہ قرأت کی تصنیف' شجرۂ سبعہ قرأت کی ترتیب' قرآن کریم کے ایک ایسے تصحیح شدہ نسخہ کی تالیف جو مصحف عثمانی کے عین مطابق ہو' اتنے ضروری اور توجہ طلب امور تھے کہ وہ اپنا تمام وقت انہی پر لگا رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ تذکرۂ قرا ایک سرسری دستاویز سے آگے نہ بڑھ سکا۔

میں اس مسودہ کے وجود سے بھی آگاہ نہ تھا۔ چونکہ جب وہ اس مسودہ پر کام کر رہے تھے' میں پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کا نامکمل مسودہ مجھ تک بڑے ڈرامائی طریقہ سے

پہنچا۔

جب قبلہ گاہیؒ کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا تو میں انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے ان کے مسودات کے بارے میں سوچنے کا استحقاق نہیں تھا اور سب سے کم علم ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں کچھ ایسا شعور بھی نہیں تھا۔ جو بھی مسودات یا مطبوعات کے نسخے تھے وہ بڑے بھائی جان قاری معین الاسلام مرحوم اور دوسرے بھائی قاری احمد پاشا مرحوم کی تحویل و تصرف میں رہے۔ ابا جان کے انتقال کے تقریباً ۲۵ سال بعد میری کتابوں کی الماری میں سے ایک پلاسٹک کا لفافہ نکلا۔ اس میں یہ مسودہ اور اس کے ساتھ چند اور قلمی دستاویزات تھیں۔ مجھے قطعاً" یاد نہیں کہ یہ نادر جواہر ریزے کب اور کس طرح میرے پاس آئے--- میں نے انہیں پڑھا اور احتیاط سے رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈھونڈا تو وہ لفافہ غائب تھا۔ سارا گھر چھان مارا' کتابوں کی الماریوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا لیکن مسودات نہ ملے۔ صبر تو کیا آتا اپنی کوتاہی اور بے بسی پر پست ہو کر رہ گیا۔ خود اپنے آپ ہی کو مطعون کرتا تھا کہ غفلت سے ایسی بیش بہا دولت یوں ضائع کر دی۔ ۱۹۷۹ء میں میرے بھائی محمد مصطفٰے عثمانی کا سکوت قلب سے اچانک انتقال ہوگیا اور کچھ روز بعد میری بھاوج نے مجھے وہ لفافہ لوٹایا کہ یہ آپ کی امانت آپ کے مرحوم بھائی کے پاس تھی۔

اس وقت سے یہ مسودات میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس عرصہ میں جس نے بھی ان کی فوٹو نقل کرانے کی خواہش کی' میں نے بلا عذر صرف واپسی کی یقین دہانی پر یہ دستاویزات حوالہ کر دیں۔ میں خود ان کی اشاعت کے لیے فراغت کا منتظر تھا لیکن برسوں کے انتظار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ فراغت حاصل نہیں ہوتی' کسی نہ کسی طرح اپنے اوقات و مشغولیات میں سے وقت نکالا جاتا ہے۔ سو اس بار خدا کے فضل سے یہ قرض ادا ہوگیا۔ حفاظ و قراء کے احوال کا یہ مسودہ نامکمل ہے۔ اول تو خود حضرت مؤلفؒ نے سوانحی خاکوں کے درمیان خالی جگہ چھوڑی ہوئی ہے گویا وہ مزید احوال درج کرنے کے خواہش مند تھے جس کی انہیں مہلت نہیں ملی یا کوائف حاصل

نہیں ہوئے۔ نیز مسودہ کے کچھ اوراق گم ہیں۔ حضرت مؤلفؒ نے حفاظ و قراء کی ترتیب میں نمبرشمار استعمال کیے ہیں اور شروع کے صفحات غائب ہونے کی وجہ سے تذکرہ نمبر ۳ کے آخری دو ورق باقی ہیں لیکن ابتدا گم ہونے کی وجہ سے یہ کہنا ممکن نہیں کہ یہ کس بزرگ کا ذکر ہے۔ پہلا مکمل تذکرہ حافظ شمس الاسلامؒ کا ہے' جس پر نمبر ۴ درج ہے۔

ابتدائی صفحات کی عدم موجودگی میں یہ کہنا بھی ناممکن ہے کہ انہوں نے اس کی تیاری کب شروع کی۔ تاہم ان کی تصنیف "شجرۂ سبعہ قرأت" کے آخر میں تذکرۂ قراء کے سلسلہ میں تعاون کی استدعا ہے اور لکھا ہے "بزرگان پانی پت کے حالات جمع کرنے میں چھ سال صرف ہوچکے ہیں"۔ یہ شجرہ رمضان ۱۳۴۷ھ (مطابق فروری ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا' گویا اس مسودہ پر کام کی ابتداء ۱۹۲۲ء/ ۱۳۴۱ھ میں ہوئی۔ مؤلف نے اپنے استاد بھائی قاری قیام الدینؒ کے تذکرہ کے آخر میں ایک سطر نسبتاً مدھم سیاہی سے زاید کی ہے۔ "افسوس صد افسوس کہ آج ۱۵ر رمضان ۱۳۴۸ھ مطابق فروری ۱۹۳۰ء کو کاربنکل کے زخم کی وجہ سے قضا کی۔ یوم سنیچر' وقت ۹ بجے صبح"۔ وقت کے اعتبار سے یہ اس مسودہ کا آخری اندراج ہے۔

مسودہ کو "طبقات" میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چونکہ ابتدائی صفحات موجود نہیں اس لیے پہلے طبقہ کی سرخی بھی ندارد ہے۔

دوسرا طبقہ تذکرہ نمبر ۱۲ حافظ قاری نورالہدیٰؒ کے سوانحی خاکہ سے شروع ہوتا ہے اور اس پر یہ سرخی درج ہے۔

"متعلقہ طبقہ سی و چہارم (۳۴) اس میں بزرگوں کا حال ہے"۔

تیسرا طبقہ تذکرہ نمبر ۱۷ مولوی قاری حافظ حکیم عبدالعلیم انصاریؒ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور اس کی سرخی ہے۔

"متعلق طبقہ سی و پنجم (۳۵) احقر کے معاصرین"۔ گویا اگر وہ اس تذکرہ کو اپنے معاصرین سے آگے نہ لے جاتے اور اپنے شاگردوں اور ان کے ہم عصروں کا احوال

درج نہ فرماتے تب بھی مکمل کتاب ۳۵ طبقات پر مشتمل ہوتی اور اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ ابتدائی صفحات میں طبقہ سی و سوئم (۳۳) کے قراء کا تذکرہ ہے تو یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ شروع کے ۳۲ طبقات میں کن اہل علم کا تذکرہ مفقود تھا۔ حضرت مؤلف نے براہ راست تو اس سلسلہ میں کوئی تحریر نہیں چھوڑی لیکن شجرۂ سبعہ قرأت کے آخر میں "استدعا" میں لکھتے ہیں "بدقسمتی سے اس وقت تک مجھے "طبقات القراء" کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا اور شاید ہندوستان میں نہ ملے۔ تاہم میں نے کچھ مواد فراہم کیا ہے"۔

"تیسری صدی تک جو شیوخؒ قرأت حدیث بھی روایت کرتے ہیں ان کے وقائع زندگی رجال کی کتابوں نے کم و بیش معلوم ہوگئے ہیں اور بعض حضرات کے حالات' علماء کی تاریخ اور سیروغیرہ کی کتابوں سے اخذ کیے گئے"۔ اس اقتباس سے یہ اخذ کرنا بعید از حقیقت نہیں کہ مؤلفؒ نے عہد نبویؐ سے لے کر اپنے معاصرین تک تمام عالم اسلام کے شیوخ قرأت کا احوال اردو میں لکھنے کا عزم کیا تھا اور اس سلسلہ میں کم از کم دو جہات میں کافی کام کر چکے تھے۔ ایک تو ابتدائی طبقات کے ائمہ کا احوال اور دوسرے پانی پت کے شیوخ کا۔ افسوس کہ پہلے مسودہ کا کوئی کھوج مجھے نہیں مل سکا۔ دوسرا مسودہ جیسا کچھ مجھ تک پہنچا ہے' تسوید و اضافوں کے ساتھ نذر قارئین ہے۔ میرے اپنے کام کی نوعیت اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اصل مسودہ میں تمام سنین و تواریخ ہجری تقویم میں ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ مستند حوالہ سے شمسی سنہ بھی درج کر دیے کہ فی زمانہ ان ہی کا چلن ہے۔ مؤلفؒ کے اکثر معاصرین اس تذکرہ کی تدوین کے وقت حیات تھے۔ حضرت نے ان کا ذکر فطرتاً" زمانہ حال میں کیا ہے۔ چونکہ آج وہ سب خدا کو پیارے ہوچکے' اس لیے میں نے صیغہ حال کو صیغہ ماضی میں بدل دیا ہے۔ جن حضرات کو میں نے خود دیکھا تھا اور جن کا زمانہ پانے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی' ان کے تذکرہ میں میں نے ایسے احوال و واقعات کا اضافہ کر دیا ہے جو میرے علم اور مشاہدہ میں تھے لیکن ایسا اضافہ کرتے ہوئے میں نے ہر جگہ صاف طور پر لکھ

دیا ہے کہ یہ میرا بیان ہے تاکہ حضرت مؤلفؒ کے بیان سے نمایاں ہو جائے اور میری کوتاہی زبان و بیان میرے ہی کھاتہ میں پڑے۔

اگرچہ حضرت مؤلفؒ کا بیان اکثر نہایت سلیس و شگفتہ ہے' لیکن اپنے علم و فضل اور اپنے زمانے کے ذوق کے مطابق انہوں نے کہیں کہیں عربی' فارسی کے اشعار کا استعمال بھی کیا ہے اور الفاظ کا بھی۔ میں نے اشعار بعینہ درج کر کے ان کا ترجمہ قوسین میں لکھ دیا اور جو الفاظ بہت نامانوس نظر آئے' ان کا یا تو ترجمہ ساتھ دے دیا یا متبادل مہیا کر دیا۔ شیوخ پانی پت کے دستور کے مطابق حضرت مؤلفؒ نے اپنا ذکر اپنے معاصرین کے ساتھ بھی نہیں کیا۔ خود اس مسودہ کی اشاعت کرتے تو اس کمی کو پورا کر دیتے۔ بہرحال میں نے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق ابتدائی باب میں ان کا تذکرہ شامل کر دیا ہے۔

جس دور کے قراء کا احوال اس تذکرہ میں درج ہے' وہ گویا پانی پت میں قرات کا سنہری دور تھا۔ اہل پانی پت کو آج تک یہ دعویٰ ہے کہ وہ بالکل اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح حضور رسول مقبولؐ نے اپنے صحابہؓ کو تعلیم کیا تھا۔ جناب مولفؒ اپنی تصنیف "شرح سبعہ قرات" میں بتاکید فرماتے ہیں کہ قرات کا مدار نقل پر ہے۔ یعنی ایک جماعت دوسری جماعت سے زمانہ در زمانہ نقل کرتی چلی آئی ہے۔ حضور کریمؐ کی حدیث مبارکہ ہے' جسے حضرت عمرؓ' حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ روایت کرتے ہیں۔ **تقرو القران کما علمتم** یعنی قرآن کو اسی طرح پڑھو جس طرح وہ تمہیں پڑھایا گیا ہے۔ تابعین میں سے حضرت عروہؒ بن زبیرؒ' حضرت عمرؒ ابن عبدالعزیزؒ اور حضرت عامر شعبیؒ فرماتے ہیں "قراۃ سنت متبعہ ہے اور پچھلا پہلے سے اخذ کرتا چلا آتا ہے۔ پس تم کو جس طرح پڑھایا جائے اس طرح پڑھو"۔

پانی پت کے قراء کا دعویٰ تھا کہ وہ قرن در قرن اسی طرح قرآن پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں جس طرح انہیں روایت در روایت قرن اولیٰ سے پہنچا۔ حضرت مؤلفؒ نے اپنی بے بدل تالیف "شجرۂ سبعہ قرأت" میں اپنی سند اپنے اساتذہ کے

واسطے سے حضور رسول کریمؐ تک بغیر کسی فصل اور انقطاع کے پہنچائی ہے۔ یعنی یہ ایک سنہری زنجیر ہے جس کے تمام حلقے بالکل عدل کے ساتھ باہم مربوط ہیں اور بیچ میں کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔

پانی پت کی قرأت کو تمام ہندوستان میں ایک سند کی حیثیت حاصل تھی اور اس امتیاز کو عموماً تسلیم کیا جاتا تھا۔ قرأت کے خواہش مند پانی پت کے قراء کو سننے کے لیے بھی اور ان سے سیکھنے کے لیے بھی دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ باقاعدہ مکاتب کے ساتھ بالعموم بیرونی طلباء کے لیے رہائش کا انتظام تھا۔ حضرت ابا جانؒ کے پاس میں نے برما اور سنکیانگ سے لے کر افغانستان تک اور تاشقند سے لے کر سیون تک کے طلباء دیکھے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے گھر میں ایک محدود وقت میں درس دیتے تھے چونکہ ان کا باقی وقت تصنیف و تالیف یا ذاتی مصروفیات میں گزرتا تھا۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ دیوبند سے درسیات اور دینی علوم کی تکمیل کرتے تھے ان میں سے بھی جو صحت کے ساتھ قرآن کریم سیکھنے کے خواہشمند ہوتے تھے وہ دیوبند جانے سے پہلے یا وہاں کے قیام کے دوران یا وہاں سے تکمیل کر لینے کے بعد پانی پت آکر قرآن پڑھتے تھے۔ جن طلباء کو باقاعدہ مدارس سے ملحق اقامت گاہوں میں جگہ نہیں ملتی تھی' وہ پانی پت کی لاتعداد مساجد کے حجروں میں اہل محلّہ یا منتظمین مسجد کی اجازت سے مقیم ہو جاتے تھے۔ ایسے طلباء کی جزوی کفالت بھی اہل محلّہ کرتے تھے۔

پانی پت میں متعدد باقاعدہ مدارس تھے جن میں قرآن کریم کی تعلیم حفظ و ناظرہ دی جاتی تھی۔ سب سے اہم تو مدرسہ رحمانیہ تھا جو شہر کی مرکزی جامع مسجد سے ملحق تھا۔ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں' جامع مسجد محمود غزنوی کے زمانہ میں تعمیر کی گئی تھی پھر اس کی تعمیر نو مولانا قاری اکرام اللہؒ اور حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث انصاریؒ نے انیسویں صدی کے وسط میں کرائی۔ اس دور کے مزارات و مساجد کے ساتھ طلبا و خدام کی رہائش کے لیے حجرے بنانے کا دستور تھا لہٰذا جامع مسجد کے ساتھ بھی متعدد حجرے تھے۔ مسجد سے ملحق تعلیم قرآن کے لیے مدرسہ حضرت محدثؒ

کے نام پر مدرسہ رحمانیہ شروع کیا گیا جس کے بیرونی طلباء ان حجروں میں قیام کرتے تھے۔ ان طلباء کو گزارہ کے لیے مدرسہ کی طرف سے کچھ وظیفہ بھی ملتا تھا۔

میرے زمانے میں اس مدرسہ کے انتظام کی نگرانی حضرت مولانا محدثؒ کے پوتے اور میرے استاد مولانا قاری عبدالحلیم انصاریؒ کرتے تھے اور وہاں کئی اساتذہ تدریس فرماتے تھے۔ جس مکتب میں میں نے قرآن کریم حفظ کیا وہ مدرسہ رحمانیہ ہی کی شاخ تھا اور ہمارے محلّہ میں قائم تھا۔ یہاں حضرت قاری مشتاق احمد خان صاحبؒ حفظ قرآن اور قرأت دونوں کی تدریس فرماتے تھے۔ ایک مدرسہ ابا جان کے عزیز شاگرد قاری شیر محمد صاحب نے اپنے مرشد روحانی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام پر "مدرسہ اشرفیہ" قائم کیا تھا جہاں قاری صاحب موصوف کی وفات کے بعد ابا جان کے ایک اور نامور شاگرد شیخ القراء مولوی فتح محمد اعمیؒ تدریس قرآن و قرأت فرماتے تھے۔ اسی طرح متعدد مدارس تھے جن کی تفصیل اب شاید بے محل ہوگی۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اہل پانی پت بالعموم جھنگ میں آباد ہوگئے جہاں انہوں نے تعلیم قرآن کے مدارس بھی جاری کیے۔ نیز حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ نے کراچی میں اور ان کے شاگرد رشید قاری رحیم بخش صاحبؒ نے ملتان میں سلسلہ تدریس جاری کیا۔ قاری فتح محمد صاحبؒ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں سلسلہ تدریس قرات جاری رکھا۔ ان کا انتقال ۱۹۸۷ء میں مدینہ منورہ ہی میں ہوگیا اور جنت البقیع کی خاک پاک میں ان کی بھی خاک شامل ہوگئی۔ ان کے شاگرد مکہ مدینہ کے علاوہ پاکستان کے متعدد شہروں میں قرآن کی تدریس کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ قاری رحیم بخش صاحبؒ کو خدا نے یہ خاص فضیلت عطا فرمائی کہ ان کے بیٹے اور داماد سب ہی قراء ہیں اور سب ہی ملتان اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں اس نور کو پھیلا رہے ہیں۔

رمضان المبارک میں پانی پت کی شبیں بہت نورانی ہوا کرتی تھیں۔ بے شمار مساجد میں تراویح کی نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی اور حفاظ "محراب" سناتے تھے۔ سوا

سپارہ روز پڑھنے والے چھبیسویں شب کو اور ڈیڑھ سپارہ روز سنانے والے اکیسویں شب کو قرآن ختم کرتے تھے۔ اکیسویں شب سے شبینے شروع ہو جاتے تھے جن میں ساری رات تلاوت قرآن سے زمزمہ پیرائی ہوتی تھی۔ پانی پت کے حفاظ اول تو پانی پت کی رونقیں چھوڑ کر باہر جاتے ہی نہ تھے لیکن اگر پانی پت میں کسی مسجد میں بھی سنانے کا موقعہ نہ ملے اور باہر جانا ہی پڑ جائے تو آخری عشرہ میں ضرور واپس آ جاتے تھے۔ اس میں صرف ایک استثناء کا مجھے علم ہے اور وہ ہے دلی کی جامع مسجد۔ وہاں سنانا ایک بہت بڑا چیلنج اور خصوصی امتیاز تھا جس کو حاصل کرنے کی بعض جید حفاظ خواہش کرتے تھے۔ دلی کی جامع مسجد کا دستور بھی نرالا تھا۔ وہاں ایک حافظ تراویح نہیں پڑھاتا تھا بلکہ متعدد حفاظ تلاوت کرتے تھے۔ دالان' سہ دریوں اور صحن میں جس کو جہاں جگہ ملتی تھی نیت باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور تلاوت شروع کر دیتا تھا۔ یہ ذکر لاؤڈ سپیکر سے پہلے کے زمانہ کا ہے۔ دلی کے من چلے جس حافظ کی تلاوت پسند کرتے تھے' اس کے پیچھے نیت باندھ لیتے تھے۔

پانی پت میں معاوضہ لے کر قرآن سنانے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اجنبی اور پردیسی طلباء شاید اپنی ضروریات کی کفالت کی خاطر کوئی نذرانہ قبول کر لیتے ہوں لیکن پانی پت والے معاوضہ یا نذرانے لینا تو درکنار' اپنی گرہ سے خرچ کر کے ختم کے روز شیرینی تقسیم کرتے تھے۔ پانی پت کی قرات کی شہرت کی وجہ سے دور و نزدیک سے حفاظ کو بلاوے آتے تھے لیکن بہت کم حفاظ جانے پر راضی ہوتے تھے۔ ایک سال (غالباً ۱۹۴۶ء کے رمضان میں) میرے شیخ قاری مشتاق احمد خان صاحبؒ میرے بہنوئی کے شدید اصرار پر جو نواب مانگرول کے سیکرٹری تھے' مانگرول کاٹھیاواڑ گئے تھے۔ لیکن شرط یہ رکھی تھی کہ آخری عشرہ وہ پانی پت میں ہی گزاریں گے۔ میں ان دنوں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور رمضان موسم گرما کی تعطیلات میں آیا۔ آخر طے یہ پایا کہ قاری صاحب اپنے دستور کے مطابق ختم کر کے واپس تشریف لے آئیں گے اور باقی شبوں میں تراویح میں پڑھاؤں گا۔ سو میں اور وہ دونوں مانگرول گئے اور اس پروگرام

کے مطابق پہلے انہوں نے اور پھر میں نے مانگرول کی مرکزی جامع مسجد میں تراویح پڑھائیں۔ حضرت قاری صاحب کو سفر خرچ کے نام سے معقول رقم پیش کی گئی جو انہوں نے میرے بہنوئی کے اصرار پر اس شرط پر قبول کی کہ اسے قرآن پڑھنے کا معاوضہ نہ سمجھا جائے۔ جس شب میں نے ختم کیا تو معززین علاقہ نے' جو مسجد میں تراویح ادا کرتے تھے' مجھے بھی ایک بند لفافہ پیش کرنا چاہا لیکن میرے بہنوئی نے سختی سے رد کر دیا بلکہ ہم نے اسے ہاتھ لگانے سے بھی انکار کر دیا۔ آخر طے یہ پایا کہ وہ رقم میری طرف سے مسجد کی تعمیر کے فنڈ میں دے دی جائے گی۔

پانی پت کی قرأت کی اس خصوصیت کا ایک منفی پہلو یہ تھا کہ بعض نادان کم علم پڑھنے والے دوسرے علاقوں کی قرات کو غیر مستند سمجھتے تھے اور اس پر طعن کرتے تھے کہ صحیح تو بس ہم پڑھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں اکثر لوگ پانی پت کی قرأت کی قدر اور پانی پت کے قراء کی منزلت کرتے تھے' وہاں کچھ لوگ پانی پت سے ناراض رہتے تھے اور دوسرے علاقوں کے بڑے بڑے قراء اہل پانی پت کے سامنے تلاوت کرتے ہوئے جھجکتے تھے کہ یہ لوگ ضرور تنقیص کریں گے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملحوظات میں ایک اندراج بہت دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ مجھے پانی پت میں امام بنایا۔ میں نے ہرچند عذر کیا کہ یہاں اہل کمال موجود ہیں مگر نہیں مانے۔ میں بے تکلف پڑھتا چلا گیا۔ نہ قصداً بگاڑا نہ بنایا' صرف مخارج کو ادا کیا۔ مجھے اعتراض کا شبہ تھا۔ مگر بعد میں تعریف کی کہ ہمارا گمان غلط تھا۔ بہت اچھا اور سادہ لہجہ ہے"۔

جہاں اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الامت جیسا بلند پایہ قاری بھی اہل پانی پت کی موجودگی میں تلاوت کرتے ہوئے جھجکتا تھا وہاں حضرت نے ایک ہی جملہ میں اس خصوصیت کا بھی ذکر فرما دیا جسے اہل پانی پت تلاوت قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یعنی سادگی اور مخارج کی صحیح ادائیگی--- قراء پانی

پت کے نزدیک صحت تلاوت کے تین اجزاء بنیادی ہیں۔ حروف قرآنی کا مکمل طور پر ان کے فطری مخارج سے ادا کرنا۔ حرکات کو صحیح طور پر ظاہر کرنا اور لحن یا حسن صوت۔ ان میں سے پہلے دو اجزاء کی تعلیم کی جاتی ہے۔ تیسری چیز عطیہ قدرت ہے جس کو ملا' مل گیا۔ کسی بھی قسم کی بناوٹ کو اور مصنوعی طور پر ترنم پیدا کرنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس سے حرکات بگڑ جاتی ہیں اور قوانین "اخفاء اور اظہار" کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی عبارت میں ایک قدرتی آہنگ اور فطری نغمگی ہے۔ جیسے پہاڑی آبشار اور جھرنے کا اپنا ہی ترنم ہوتا ہے۔ اس آہنگ اور نغمگی کا ادراک و شعور اسے ہی ہوسکتا ہے جس نے قرآن کو صحیح پڑھنا سیکھا ہو اور صحیح پڑھنے والوں کو سنا ہو۔ جیسے فطرتی آوازوں کا حسن اسے ہی متاثر کرتا ہے جس نے اس ترنم اور آہنگ کے لاشعوری ذوق کی تربیت کی ہو۔ قرآنی لب و لہجہ کی یہی سادگی حرمین شریفین میں پائی جاتی ہے۔ مجھے جتنی بار بھی مسجد نبوی میں باجماعت جہری نماز ادا کی سعادت نصیب ہوئی' یوں لگا کہ تلاوت کوئی پانی پت کا قاری کر رہا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یوں جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں' یہی اہل پانی پت کا دعویٰ بھی تھا کہ انہیں جس طرح مدینہ منورہ سے قرآن پہنچا' انہوں نے روایت کے ذریعہ اسی طرح آگے پہنچایا اور نسل در نسل دیانت و ثقاہت نقل کے ذریعہ مدنی انداز کو محفوظ رکھا۔

مسلمان دنیا میں جہاں بھی گئے' قرأت کی روایت ان کے ساتھ گئی۔ قرآن دنیا کی وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو نہ صرف حرف و حرکات کے ساتھ آج تک اسی طرح محفوظ ہے جس طرح فرشتۂ وحی جبریل امین علیہ السلام نے قلب حبیبؐ پر منتقل کیا بلکہ یہ ہی وہ واحد صحیفہ آسمانی ہے جو دنیا کے ہر ملک اور ہر لسانی گروہ میں اپنی اصلی زبان عربی میں پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ معجزۂ قرآنی ہے کہ تمام السنہ قدیم میں صرف عربی ہی

آج بھی کروڑوں افراد کی مادری اور روزمرہ کی زبان ہے۔ لہٰذا مسلمان ہر جگہ اسے عربی زبان میں پڑھتے ہیں اور اس کے پڑھنے کا طریق حتی المقدور اور تاحد استطاعت سیکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک لسانی کلیہ ہے کہ غیر زبان کے تلفظ پر بھی اور کسی حد تک حرکات پر بھی سیکھنے والے کی مادری زبان کے مخارج کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ جس طرح اہل عرب ٹ' پ' چ' گ وغیرہ آوازیں صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے' اسی طرح غیر عرب ح' ع' ق' کی ادائیگی بمشکل کر سکتے ہیں بلکہ بعض حالات میں نہیں کر سکتے۔

پانی پت میں جو مسلمان محمود غزنوی کے زمانے سے آباد تھے' ان میں ایک خاصی تعداد عربی النسل لوگوں کی تھی لیکن مقامی آبادی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ ابتداء" قرآن کی تلاوت صحت کے ساتھ کی جاتی ہوگی لیکن آہستہ آہستہ مقامی اثرات نے قرأت کو متاثر کیا اور مخارج و حرکات بگڑ گئے۔ آج سے تقریباً دو سو سال قبل ایک عجیب و غریب اتفاق نے پانی پت کو مدنی آہنگ تلاوت سے نواز دیا۔

پانی پت کے بے فکر' غیر سنجیدہ تماش کے رئیس زادوں میں مختلف مشاغل مثلاً پتنگ بازی' کبوتر بازی' پہلوانی اور آتش بازی کے مقابلوں کا رواج تھا۔

کئی خاندان ان مشاغل کے طفیل برباد ہوئے اور کئی جائیدادیں ان شوقوں میں تباہ ہوئیں۔ کبوتر بازی اور پہلوانی کا تو کوئی موسم یا موقعہ متعین نہیں تھا لیکن پتنگ بازی کے مقابلے عیدالفطر کے تین دنوں میں اور آتش بازی کے مقابلے شب برات پر ہوتے تھے۔ میں نے اپنے لڑکپن میں یہ دونوں ہی تماشے دیکھے۔ آتش بازی کا آخری مقابلہ غالباً ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر ایسی تھی کہ اس کی دھندلی دھندلی تصویریں آج بھی ذہن کے پردہ پر ابھرتی ہیں۔ اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ان کیمیاوی اشیاء کی فروخت پر پابندی لگ جانے کے سبب جو آتش بازی بنانے میں استعمال ہوتی تھیں اور عام مہنگائی کی وجہ سے یہ رسم بد اپنی موت آپ ہی مر گئی۔

بہرحال ایک عام روایت کی رو سے' جسے تسلسل کے سبب تاریخی سند حاصل ہوگئی ہے' ایسے ہی ایک آتش بازی کے مقابلہ میں حافظ مصلح الدین نامی عباسی خاندان

کے ایک شریف زادہ کے ہاتھوں ایک شخص مہلک طور پر زخمی ہوگیا۔ وہ اس حادثہ سے ایسے سہم گئے کہ قانون کے یا انتقامی کارروائی کے خوف سے وطن سے فرار ہوگئے اور خوبیٔ تقدیر نے انہیں حجاز مقدس پہنچا دیا۔ سچ ہے' خیرو شر کا مالک وہ حکیم و قدیر خدا ہے جو اپنی حکمت کے مطابق خیر سے شر اور شر سے خیر برآمد فرماتا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر حافظ مصلح الدین کو وہاں کی قرات نے اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے مدینہ منورہ کے شیخ القراء اور شیخ الحرم حضرت قاری عبداللہ مدنیؒ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر تجوید و قرأت سبعہ کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ کامل پندرہ سال مدینہ النبیؐ میں جاروپ کشی اور اکتساب علم کرنے کے بعد انہوں نے وطن واپسی کی ٹھانی اور پانی پت آکر تجوید و قرأت کی تدریس شروع کر دی۔ یوں تو آپ کے حلقۂ درس سے کئی باصلاحیت افراد نے اکتساب سعادت کیا لیکن تکمیل کی انتہا کو آپ کے صاحبزادے نے پایا جن کا نام آپ نے اپنے شیخ کے نام پر "عبیداللہ" رکھا تھا اور جنہیں پیار سے "لالا" کہا جاتا تھا۔ چنانچہ آج تک آپ عرف عام میں "قاری لالا" ہی کہلاتے ہیں اور عوام الناس آپ کے اصلی نام سے بہت کم واقف ہیں۔ قاری مصلح الدین صاحب نے اپنے صاحبزادے کے علاوہ اپنی دختر نیک اختر مسماۃ فضل النساء کو بھی تجوید و قرأت کا منتہی بنا دیا اور آپ خواتین کو بالعموم اور پس پردہ مردوں کو بھی درس دیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کے علاوہ جن قراء نے آپ سے اکتساب فیض کیا' ان میں دو بھائی مولانا قاری محمدی انصاری اور مولانا قاری قادر بخش انصاری ابنائے خواجہ خدا بخش انصاری قادری نے اختصاص کا درجہ حاصل کیا۔ پانی پت میں قرأت کی جو روایت چلی وہ ان ہی حضرات سے چلی مثلاً مولانا قاری قادر بخش انصاری سے شیخ القراء قاری نجیب اللہ عثمانی اور شیخ القراء مولانا قاری کبیر الدین نے اخذ تجوید و قرأت کیا۔ آپ دونوں حضرات سے حافظ قرأت و مجود عصر قاری عبدالرحمٰن اعمی بن عبدالصمد خاں حنفی نقشبندی توکلی نے پڑھا اور ان سے شیخ الشیوخ مولانا قاری ابو محمد محی الاسلام عثمانی نے اخذ فیض کیا اور ان کا سلسلہ تلمذ پاکستان و ہند کے متعدد شہروں

کے علاوہ مکہ مدینہ تک بحمداللہ پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ الشیوخ مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث انصاریؒ نے اپنے والد ماجد قاری محمدی انصاریؒ سے پڑھا اور پھر اپنے چچا قاری قادر بخشؒ کو پے درپے سنایا اور پھر خود قاری عبیداللہ عرف قاری لالا سے کسب فیض کیا۔ حضرت مولانا محدث موصوفؒ سے پانی پت کے تمام سلسلہ ہائے قرات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکتساب فیض کیا اور وہ بلا اختلاف پانی پت کی قرأت کے ائمہ میں سے ہیں۔

حضرت قاری لالا کی ذات سے بے شمار روایات پانی پت میں مشہور تھیں جن سے ان کے کمال فن اور زہد و تقویٰ کا اظہار ہوتا تھا۔ کہتے ہیں اہل پانی پت کو جو جاگیریں مختلف سلاطین آگرہ و دہلی کی طرف سے ان کی خدمات کے صلہ میں یا ان کے علم و فضل کے اعتراف کے طور پر ملی تھیں' ان پر "معافی علی الدوام" تھی یعنی کوئی سرکاری لگان یا ٹیکس دینا نہیں پڑتا تھا۔ انگریزی عملداری میں نیا بندوبست ہوا تو ان جائیدادوں پر بھی لگان لاگو ہوا۔ جب مقامی افسران کے سامنے کوئی پیش نہ گئی تو شرفاء پانی پت نے قاری لالا صاحب کو سلطان ٹرکی کی خدمت میں بھیجا۔ کہتے ہیں سلطان وقت سلطان عبدالعزیز خان بڑے جید حافظ اور قاری تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی کہ ہندوستان سے ایک نامور قاری آئے ہوئے ہیں اور ملاقات کے متمنی ہیں تو کہا بلاؤ۔ امتحان کر کے دیکھتے ہیں کہ واقعی قاری و حافظ ہیں یا محض نام اور لقب استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت کو باریابی ملی۔ سلطان نے ہر طرح سے امتحان لیا اور حفظ و تجوید دونوں میں کامل پایا' بہت خوش ہوئے۔ قدر افزائی کی اور اتنی دور سفر کر کے آنے کی وجہ پوچھی۔ حضرت قاری صاحب نے مدعا بیان کیا۔ سلطان ان کی بے غرضی سے اور بھی متاثر ہوئے کہ اپنی ذات کے لیے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے نام ایک ذاتی خط لکھا جس کے اثر سے پانی پت کے زمینداروں کی "معافی علی الدوام" بحال ہوگئی۔ ایک روپیہ لگان پر صرف ایک پیسہ دینا پڑتا تھا۔

حضرت قاری لالا کا مزار عیدگاہ کے احاطہ میں تھا۔ ابا جان عیدین کی نمازوں کے

بعد ضرور وہاں جا کر فاتحہ پڑھا کرتے تھے اور میں چونکہ انگلی پکڑے ساتھ ہوتا تھا' لہٰذا مجھے بھی حضرت کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو میں سمجھتا تھا کہ قبر پر لالہ کے پھول اگتے ہوں گے اور جب کوئی پھول نہ دیکھتا تو حیران ہوتا تھا۔ اب تو سیاح بتاتے ہیں کہ نہ وہ عیدگاہ باقی رہی نہ وہ قبرستان۔ اس شہر خموشاں کی جگہ زندوں نے بستیاں بسا لیں۔ ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک!

یہ مختصر سا تعارف اور تذکرہ پانی پت کی قرأت کا اس لیے کر دیا کہ کہیں اس پاکیزہ روایت کی یاد بھی ذہنوں سے محو نہ ہو جائے۔ میں پانی پت سے نکلا ہوں تو میٹرک کا امتحان اسی سال پاس کیا تھا۔ لڑکپن سے نکل کر جوانی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ آج میں بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا ہوں اور میرے گرد و پیش وہ نسلیں بساط زندگی پر محو عمل ہو رہی ہیں جو ان اذکار سے بالکل بے خبر ہیں۔ لہٰذا یہ ان کی امانت ان کی نذر کرتا ہوں تاکہ اپنے بزرگوں سے ملوں تو شرمسار نہ ہوں۔ اگرچہ یہ تمہید کافی طویل ہوگئی ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان قارئین کی رہنمائی کے لیے جو فنِ قرأت سے ناواقف ہیں' کچھ ضروری معلومات پیش کر دی جائیں۔ اس برصغیر میں بالعموم لفظ "قاری" بلا تخصیص ہر قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ عام لغت ہونے کے علاوہ ایک علمی اصطلاح بھی ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو واقعی اس کا استعمال ہر پڑھنے والے کے لیے بلا تخصیص ہو سکتا ہے اور اس میں کچھ قرآن کریم کے پڑھنے کی بھی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ "قرء" کے معنی محض "پڑھنے" کے ہیں لیکن اصطلاحاً" لفظ "قاری" کا اطلاق صرف قرآن کریم کے اس پڑھنے والے پر ہوتا ہے جو ایک سے زیادہ روایات میں قرآن حکیم کی تلاوت کر سکے۔ صرف ایک روایت میں قرآن کریم کو صحت اعراب و مخارج کے ساتھ پڑھنے والے کو (میرے خیال میں) مُجوِّد کہنا زیادہ قرین حقیقت ہوگا۔ جس نے پورا قرآن

کریم ایک روایت میں حفظ کیا ہو، اسے "حافظ" کہا جائے گا نہ کہ قاری۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اصطلاحاً" جس خوش نصیب کو "قاری" کا مقام اور مرتبہ حاصل ہو، وہ لازماً حافظ بھی ہوگا اور مجود بھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر حافظ اصطلاحاً" قاری بھی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر مجود حافظ ہو۔ ناظرہ پڑھنے والا بھی جو صحت کی تمام شرائط کے ساتھ تلاوت کرتا ہے، وہ بھی مجود کہلائے گا۔

اب یہ امر تشریح طلب ہے کہ "قرأت" یا "علم قرأت" کیا ہے۔ حضور کریمؐ قبیلہ قریش کی شاخ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم لغت قریش پر نازل ہوا۔ لیکن عرب میں متعدد قبائل آباد تھے اور اس وسیع و عریض ملک میں دور دراز فاصلوں پر بسنے والے مختلف قبائل عربی کی مختلف لغات بولتے تھے۔ ان سب کو بنو ہاشم کی لغات پر جمع کرنا شاید مقصد تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا لہٰذا حضور کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اجازت سے مختلف قبائل کو ان کی لغات پر قرآن کریم کی تعلیم فرمائی اور یوں آپ کی حیات طیبہ میں کلام الٰہی متعدد لغات میں پڑھا جانے لگا۔ حضور کریمؐ کی حدیث ہے "**اِنَّ هٰذَا الْقُرآنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَؤُا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ**" (صحیح بخاری)۔

"یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ پس ان میں سے جو تمہارے لیے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو"۔

علمائے محققین نے تشریح فرمائی ہے کہ قرآن کریم کی جو قرأتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، ان میں فرق و اختلاف سات نوعیتوں پر مشتمل ہے جن کی تفصیل قرأت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ان قرأتوں کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا بلکہ بعض اختلافات سے فقہی مسائل اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قرأت کی کل تعداد کتنی تھی جو حضور کریمؐ کی تعلیم اور اجازت سے رائج ہوئیں۔ قرأت کی جو ابتدائی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں بیس

سے زیادہ قرأتیں جمع کی گئی تھیں۔ پھر علامہ ابوبکر ابن مجاہدؒ نے' جو بڑے جیّد قاری اور اس فن مبارک کے امام تھے' ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قاریوں کی قرأتیں جمع کی تھیں۔ ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قرأتیں باقی قرأتوں کے مقابلہ پر بہت زیادہ مشہور ہوگئیں اور ایک عام غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی کہ عوام الناس "سبعۃ احرف" سے یہی سات قراتیں مراد لینے لگے۔ اس کے بعد متعدد علماء نے سات کے بجائے دس قرأتیں ایک کتاب میں جمع کر دیں اور یوں "قرأت عشرہ" کی اصطلاح مشہور ہوگئی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے جو مصحف تیار کرایا' اس میں الفاظ پر نہ نقطے لگائے گئے تھے نہ حرکات (زبر' زیر' پیش وغیرہ) اور اسے تمام متواتر قرأتوں کے مطابق پڑھا جا سکتا تھا۔ پھر آپ نے جب اس مصحف کی نقول اسلامی مملکت کے مختلف بلاد (صوبوں) میں بھیجیں تو ان کے ساتھ قراء بھی بھیجے جو لوگوں کو قرأتِ متواتر کے مطابق تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے اس عظیم کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہوگیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانیؓ کے خلاف کسی طریقہ پر لکھنا جائز نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے اور صحابہؓ اور تابعینؒ نے مصاحف عثمانیؓ کی نقول تیار کر کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی۔

حضرت مؤلفؒ شاید اپنی اس تالیف کا نام اس نوع کی تصنیفات کی روایت کے مطابق "طبقات القراء" رکھتے لیکن انہوں نے ہر تذکرہ میں حفاظ کے لیے محض لفظ "حافظ" اور قراء کے لیے "حافظ اور قاری" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ راقم الحروف نے محض عام قارئین کی سہولت کے لیے اور زمانہ کے ذوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک آسان نام "پانی پت کے قاری" تجویز کر دیا ہے' جس کے لیے اہل علم سے معذرت خواہ ہے۔

شیخ القراء امام المجوّدین

مولانا حافظ ابو محمد محی الاسلام عثمانیؒ

پروفیسر ایم۔ اے۔ عثمانی

پانی پت ۷۰۴ھ (مطابق ۱۰۱۶ء) میں مسلمانوں کا مسکن بنا۔ جب تقریباً دو سو سال بعد دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو پانی پت کی فوجی اور اقتصادی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اپنے محل وقوع کی وجہ سے پانی پت شہر نے مغرب کی جانب سے حملہ آور ہونے والوں کے راستہ میں قدرتاً" دلی کی آخری چھاؤنی اور فصیل کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تین بار دلی کی قسمت کا فیصلہ پانی پت کے میدان میں ہوا۔ پانی پت کے مسلمان شرفا مختلف حیثیتوں سے دلی اور آگرہ کے درباروں سے منسلک رہے۔ ان میں نامور علماء بھی گزرے ہیں اور فضلاء بھی۔ اہل نظم و نسق بھی تھے اور اہل قضاء و منصفی بھی۔ مسلمان حکومتوں میں بالعموم اور مغلیہ دور میں بالخصوص مناصبِ حکومت موروثی ہوا کرتے تھے۔ بشرط اہلیت باپ کے بعد بیٹے کو منصب بھی وراثتاً" مل جاتا تھا' لہٰذا اہل منصب اپنی اولاد کی تربیت کا خاص اہتمام کرتے تھے اور وہ علوم و فنون سکھاتے تھے' جو ان کے منصب کی شرط ہوتے تھے' پھر اوائل عمر میں اپنے بیٹوں کو دربار میں پیش کرتے تھے اور مناسب امتحان و آزمائش کے بعد وہ ماتحت مناصب پر تعینات کر دیے جاتے تھے۔ منصب قضاء (Justice) کا عہدہ عثمانیوں کے خانوادہ میں حضرت مخدوم شیخ جلال الدین کبیرالاولیاء کے صاحبزادے کی اولاد میں نسلاً" بعد نسلٍ چلا آتا تھا۔ اسی نسبت سے وہ خانوادہ قاضی

زادوں کا خاندان کہلاتا تھا اور آج بھی ان کے اخلاف اپنے نام کے ساتھ لفظ "قاضی" لکھتے ہیں۔ سرکاری طور پر اس منصب پر جو آخری بااختیار قاضی ہوئے وہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب محدث مفسر مظہری مجددیؒ تھے۔ (اگرچہ منصب آپ کے بعد بھی آپ کی تیسری پشت میں قاضی محمد صفوۃ اللہ تک چلتا رہا) حضرت محدثؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف "تفسیر مظہری" اب اصل عربی متن کے ساتھ بھی اور اردو ترجمہ میں بھی شائع ہو کر مشہور و معروف ہو چکی ہے۔

اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ پانی پت مختلف علوم و فنون کا مرکز رہا۔ حضرت قاری محی الاسلام صاحبؒ اپنی تصنیف "شرح سبعہ قرأت" جلد اول میں لکھتے ہیں "پانی پت ہمیشہ سے دہلی کا مضافاتی قصبہ ہے اور باستثناء تجوید ہر ایک دینی اور دنیوی امر میں اس کے دامن سے وابستہ چلا آتا ہے۔ اگر دہلی کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہ' حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ اور حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہ نے اپنے پاک قدوم سے سرفراز فرمایا تو پانی پت کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر قدس سرہ' حضرت سید شمس الدین ترک شاہ ولایت قدس سرہ اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیرالاولیا قدس سرہ نے رونق بخشی۔ اگر دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ' حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاقؒ پیدا ہوئے تو پانی پت میں حضرت قاضی ثناء اللہؒ اور حضرت قاری عبدالرحمٰن انصاریؒ۔ اگر دہلی سے ذوق مرحوم و مومن مرحوم و غالب مرحوم نمودار ہوئے تو پانی پت سے منت و ممنون و حالیؒ۔

لیکن جس طرح دہلی مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ زوال پذیر ہوا اسی طرح پانی پت بھی اپنی سیادت و افتخار سے محروم ہوتا گیا۔ قوموں کی زندگی پر معاشی عوامل بہت گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں' جب مشرقی علوم کے حصول کے بعد مناصبِ معاش کا ملنا متروک ہوگیا تو ان علوم کی طرف سے خاص و عام کی توجہ بھی ہٹ گئی اور ان کے پڑھنے والے بھی ختم ہوتے گئے اور پڑھانے والے بھی۔ خود مخدوم زادوں

میں علم دین کا حصول محدود ہوتے ہوتے حفظِ قرآن تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ کہاں تو یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ عربی فارسی کے ذریعہ تمام دینی اور دنیوی علوم حاصل کیے جاتے تھے اور کہاں یہ وقت آیا تھا کہ ان زبانوں کی تعلیم متروک ہوگئی تھی۔ ایک وقت تھا کہ قرآن پڑھنا اور پڑھانا وجہِ شرف و افتخار تھا' کہاں یہ وقت آیا تھا کہ قرآن کریم کے مکتب میں عموماً غریب غرباء کے بچے جاتے تھے اور روایتی شرفاء میں معدودے چند خاندان ایسے رہ گئے تھے جو اپنی دیرینہ روش کے مطابق اپنی اولاد کی تعلیم کی ابتداء حفظِ قرآن سے کرتے تھے۔

تاہم ۱۹۴۷ء تک پانی پت میں متعدد مدارس قرآن کی تعلیم و تدریس کے قائم تھے۔ اس کے علاوہ باعزت اور باپردہ خواتین اپنے گھروں میں لڑکیوں کو (اور لڑکوں کو بھی) قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں اور شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب گھرانہ ہوگا' جہاں سے صبح و شام قرآن کریم کی تلاوت کی آواز سنائی نہ دیتی ہو۔ اس وقت بھی پانی پت میں کئی ایک بلند مرتبہ قراء حضرات موجود تھے لیکن امام القراء کا مقام اور منتہی کا درجہ حضرت مولانا قاری ابو محمد محی الاسلام عثمانیؒ کو حاصل تھا۔

ابا جان غالباً ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس کا تعین دو شواہد سے ہوتا ہے۔ اول تو اماں جان فرمایا کرتی تھیں کہ ہماری شادی ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ اس وقت میری عمر سولہ سال اور تمہارے والد کی عمر ۱۹ سال تھی۔ دوسرے ابا جان خود حافظ قاری نورالہدیٰؒ کے تذکرہ میں کہتے ہیں "احقر کی عمر آپ کے انتقال کے وقت دس سال کے قریب تھی اور پندرہ سپارے پڑھ چکا تھا" اور قاری صاحب موصوفؒ کی تاریخ انتقال ۱۳ر جون ۸۸ء درج فرمائی ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۲۴ر ذیقعد ۱۲۹۵ھ کو پیدا ہوئے جو پیر کا دن تھا اور شمسی حساب سے تاریخ ۱۹ر نومبر ۱۸۷۸ء بنتی ہے' چونکہ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے لہٰذا ناز و نعم میں پرورش ہوئی۔ ہمارے دادا قاضی مفتاح الاسلامؒ درویش منش بزرگ تھے "دنیا سے متنفر اور بیگانہ رہتے تھے" پانچ بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور آخری حج کے سوا ہر بار چھ چھ مہینہ یا اس سے زیادہ مجاور حرمین

رہے۔ اس کے علاوہ نجف اشرف' کربلاء معلیٰ' کاظمین اور بغداد میں دو سال سے یادہ معتکف رہے۔ ہندوستان کے مزارات میں سب جگہ چلّے کیے' بالخصوص خواجگان جمیر' دہلی' پاک پتن اور پیران کلیر کے مزارات پر بارہا حاضر ہوتے تھے' نتیجہ یہ تھا کہ انگی زندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہماری دادی جان نے اپنی زندگی زیادہ تر میکہ ہی میں گزاری۔ ان کے والد مولوی اکرام اللہ صاحبؒ بڑے بلند پایہ عالم' خوش حال زمیندار اور بااثر رئیس تھے۔ مولوی اکرام اللہؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی سلامت اللہ صاحب اپنے والد کے صحیح جانشین ہوئے۔ وہ بھی بڑے عابد اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ اکثر وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ غرض ابا جان کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کی پھوپھی بشیرالنساء بیگم اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھیں اور ہمارے دادا جان سے بمنزلہ ماں کے سلوک کرتی تھیں۔ انہیں بھتیجے سے عشق تھا اور انہوں نے بھی ابا جان کی تربیت میں بہت حصہ لیا۔ اولاً شرفاء کے دستور کے مطابق قرآن کی تعلیم کے لیے مکتب بھیجے گئے۔ اس وقت حضرت قاری حافظ عبدالرحمٰن ضریر (نابینا) اس فن میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ پھوپھی نے خود بھتیجے کو جا کران کے سپرد کیا۔ وہ قاری صاحبؒ سے بیعت بھی تھیں۔ حضرت قاری عزیز صاحب نے خود حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری محدث رحمتہ اللہ علیہ سے' جو امام وقت تھے' تکمیل قرأت کی تھی۔ ابا جان نے بھی حفظ قرآن کے بعد حضرت محدث رحمتہ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور فن تجوید و قرأت میں وہ مرتبہ و مقام حاصل کیا کہ اپنی زندگی میں خود سند بن گئے۔ پورے برصغیر میں ان کے اس مرتبہ کو تسلیم کیا گیا اور مشتاقانِ علم افغانستان سے لے کر برما تک اور سنگیانگ سے لے کر سیلون تک سے کشاں کشاں تحصیل قرأت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حکیم الامت حضرت شاہ مولانا قاری حافظ اشرف علی تھانویؒ سے ایک بار کسی سائل نے قرأت کے ایک مسئلہ پر فتویٰ پوچھا۔ حضرت موصوف نے وہ خط بجنسہٖ ابا جان کو بھیج دیا اور اس پر تحریر فرمایا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں کسی کو حق

نہیں پہنچتا کہ وہ قرأت کے مسئلہ پر رائے دے' لہٰذا آپ سائل کو جواب عنایت فر
دیں۔ حضرت تھانوی صاحبؒ کے اس تبصرہ سے ان کے انتہائے انکسار کے علاو
دونوں بزرگوں کی بلندی علم و مرتبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ابا جان کے تبحّر علمی کا
ثبوت ان کے تدریسی کام کے علاوہ ان کا تصنیفی ورثہ بھی ہے۔ ان کی مایہ ناز تصنیف
"شرح سبعہ قرأت" ہے' جس کا پہلا حصہ ان کی زندگی میں طبع ہوگیا تھا۔ اردو زبان
میں اس فن پر یہ ایک بے بدل تصنیف ہے جو آج بھی اپنی نایابی کے باوجود اسی طرح
سند ہے' جس طرح اپنی اشاعت کے وقت (۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں) تھی۔ اس کے
ساتھ ایک رسالہ "سند سبعہ قرأت" تصنیف فرمایا جو اپنے شاگردوں کو تکمیل پر عطا
فرماتے تھے اور جو اس فن کی نہایت مستند اور مختصر تاریخ ہے۔ ان کا اس فن میں
تیسرا بڑا کارنامہ قرآن کریم کے ایک ایسے نسخہ کی اشاعت تھا جو تمام و کمال "مصحف
عثمانی" کے اوصاف کا حامل تھا اور صدہا برس سے قرآن کریم کی نقل و طباعت میں جو
بے احتیاطیاں روا رکھی گئی تھیں ان سب سے پاک تھا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ ۱۳۴۳ھ
سے ۱۳۵۲ھ تک نو سال کی مسلسل جدوجہد سے تیار کیا اور بڑے حسن اہتمام کے
ساتھ اسے مطبع علیمی سے' جو سید عبدالعلیم مرحوم (پسر مولانا سید عبدالاحد مرحوم
مالک مطبع مجتبائی) کی ملکیت تھا' طبع کرایا۔ اس مقدس نسخہ کی تیاری میں جن امور کا
اہتمام کیا تھا ان کا بالتفصیل احوال ایک مبسوط پیش لفظ میں درج کیا جس سے ان کے
تبحر علمی اور اس فن مبارکہ سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں
بیان کرنا ضروری ہیں' جس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ والد
صاحب سے بزرگانہ شفقت فرماتے تھے اسی قدر والد صاحب ان سے عقیدت و محبت
رکھتے تھے' چنانچہ اس نسخہ کی طباعت سے پہلے ان امور پر ان سے ناقدانہ رائے کی
استدعا کی اور جب حضرت تھانوی صاحبؒ کی طرف سے ان تمام نکات پر فرداً فرداً
اثبات و پسندیدگی حاصل ہوگئی تب ہی قرآن کریم کی اشاعت کی اجازت دی۔ پھر بے
نفسی کا یہ عالم کہ نو سال کی اس محنت کا معاوضہ تو درکنار اپنی ہی سعی و اہتمام سے

/37131/

طبع شدہ قرآن کریم کا ایک نسخہ بھی اپنے گھر کے لیے نہ لیا۔ میں اس زمانے میں بہت کم عمر تھا اور مکتب کے ابتدائی درجات میں پڑھتا تھا کہ ایک روز ایک ساتھی طالب علم نے' جو غالباً حفظ کے درجہ میں تھے' مجھے وہ قرآن کریم دکھایا۔ افسوس کہ اس نو عمری میں مجھے اس کام کی اہمیت کا اس سے زیادہ کوئی احساس نہ تھا کہ ہمارے ابا جان کا نام بھی سرورق پر چھپتا ہے۔ کچھ عرصہ گزرا سید عبدالعلیم مرحوم کے صاحبزادے سید عبدالسلیم صاحب' جو آفتاب عالم پریس کے مالک ہیں' میرے پاس تشریف لائے تھے کہ شاید ہمارے گھر میں اس قرآن کا کوئی نسخہ ہو اور میرے انکار پر بہت مایوس ہوئے۔ وہ نہایت اہتمام سے پاکستان میں قرآن کریم کے اس صحت شدہ نسخہ کی اشاعت کا عزم رکھتے ہیں (اس مضمون کے قارئین سے التماس ہے کہ اگر ان کے پاس یا ان کے علم میں اس قرآن کریم کا کوئی نسخہ ہو تو اس ضمن میں اعانت فرمائیں)۔

علاوہ علوم قرآنیہ کے دیگر دینی علوم یعنی تفسیر' حدیث اور فقہ میں ان کے تبحر کا ثبوت تفسیر مظہری کی تسوید و تصحیح ہے' لیکن یہ علوم کب اور کس طرح حاصل کیے ان کی تفصیل نہیں چھوڑی۔ حقیقت تو یہ ہے شیوخ پانی پت کا طریق اس سلسلہ میں انتہائی بے نفسی کا رہا ہے۔ ہمیشہ کام سے غرض رکھی' کبھی نام کی طرف التفات نہ کیا۔ اپنے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ ابا جان نے اپنی تحریرات میں صرف ایک استاد کا ذکر کیا ہے اور وہ تھے مولانا قاری حاجی محمد اسحاق صاحبؒ۔ بہت بچپن میں مجھے دو تین بار ان کی خدمت میں اپنے ساتھ لے کر گئے' حضرت حاجی صاحب دلی میں غالباً سبزی منڈی کے علاقے میں رہا کرتے تھے۔ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ نہایت نورانی صورت بزرگ تھے۔ ابا جان ان سے انتہائی ادب و احترام سے ملتے تھے اور میں دل میں حیران ہوتا تھا کہ سارا شہر تو میرے ابا جان کا ادب کرتا ہے اور وہ ان بڑے میاں کے سامنے یوں بچوں کی طرح مؤدب ہو جاتے ہیں۔ ان کی درسی تعلیم کے سلسلہ میں دو روایات میں نے گھر میں سنی تھیں۔ حضرت شیخ الہند

مولانا محمود الحسنؒ میرے دادا حاجی مفتاح الاسلام صاحبؒ کے ذاتی دوست تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو دیوبند لے گئے اور شیخ الہندؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے' اگرچہ قیام تو ہاسٹل میں کرے گا' لیکن کھانا میرے گھر سے کھائے گا۔ سو دیوبند میں داخل ہوگئے۔ خدا جانے کتنا عرصہ گزرا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ غالباً حج پر تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں ایک روز کھانے کے لیے پہنچے تو شاید گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ شیخ الہندؒ کے صاحبزادے نے فرمایا میاں طالب علم' آپ ذرا ٹھہر کر آیئے گا۔ یہ ٹھہرے زمینداروں کی اولاد' بطور عزیز یا مہمان تو کھانا کھانا منظور تھا' بطور طالب علم گویا خیرات یا صدقہ لینا ان کی شان کے خلاف تھا' لہٰذا انا کی اس مجروحیت پر سخت دل گرفتہ ہوئے اور فوراً ہی گھر لوٹ آئے۔ دادا جان اپنے دستور کے مطابق شہر میں نہیں تھے۔ خدا جانے حج پر نکلے ہوئے تھے یا زیارات پر۔ سو ابا جان آزادی سے کھیل کود اور سیر و شکار میں وقت گزارنے لگے۔ آخر ان کی پھوپھی نے جو ان سے عشق کی حد تک محبت کرتی تھیں اپنے دوسرے بھتیجے قاضی رضی الاسلام صاحب کو اس طرف توجہ دلائی اور وہ انہیں لکھنؤ چھوڑ آئے اور وہیں سے انہوں نے علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ ان میں سے پہلی روایت میں نے اپنی باجی سے اور دوسری اماں جان سے سنی۔

ابا جان کی زندگی کا غالباً دوسرا بڑا علمی کارنامہ تفسیر مظہری کی تسوید و تصحیح ہے۔ متاخرین میں یہ سب سے اہم اور سب سے مستند تفسیر ہے جسے عالم بیدل حضرت مولانا قاضی محمد ثناء اللہ صاحب محدث پانی پتی نے اپنے مرشد حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کی یادگار کے طور پر اٹھارہ سال کے عرصہ میں ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں مکمل کیا۔ حضرت قاضی صاحبؒ کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔ صرف ان کے علو مرتبت کے بارے میں دو روایات بطور تبرک عرض کرتا ہوں۔ مشہور ہے کہ آپ جس وقت حضرت شہیدؒ کی مجلس میں حاضر ہونے کو ہوتے تھے' حضرت والاؒ اپنے قریب جگہ خالی کرا دیتے تھے اور حضرت قاضی صاحبؒ وہاں آکر نہایت ادب سے بیٹھ جاتے تھے۔ ایک دن

ا

نمرة ٩٨

بعون الله الملك العلام

قد انطبع

المجلد الأول

من

التفسير المظهري

للحبر العلامة والبحر الفهامة حامل الشريعة والطريقة بيهقي الوقت علم الهدى

القاضي محمد ثناء الله العثماني

الحنفي المظهري المجددي النقشبندي الفاني فتي المتوفى سنة ١٢٢٥

بعهد

سلطان العلوم محي الملة والدين اعلحضرت مير عثمان عليخان بهادر مالك سرير مملكة الدكن خلد الله ملكه وسلطنته

بامر

صاحب الوزارة والامارة الامير الاكبر المخاطب بالنواب لطف الدولة بهادر وزير العدلية والشرعية وامير مجلس

اشاعة العلوم

على نفقة مجلس اشاعة العلوم الكائن بحيدر آباد الدكن حرسها الله عن الشرور والفتن

قد اهتم بطبعه العبد المستهام ابو محمد محي الاسلام عفا الله عنه

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝

هذا كتاب جليل صنف لتذكرة الشيخ الشهيد سيدنا ومولانا ميرزا جانجانان مظهر قدس سره

الموسوم

بالتفسير المظهري

منه

الفاتحة والبقرة

تاليف الشيخ الاكمل بيهقي الوقت علم الهدى مولانا القاضي محمد ثناء الله العثماني الحنفي المظهري النقشبندي الفاني فتي رضي الله عنه وعن آبائه ومشائخه ولد رحمه الله في سنة ثلاث واربعين بعد الالف ومائة من الهجرة (سنة ١١٤٣) او قبله بسنة او سنتين يقاني فت ونشأ بها فحفظ القرآن وعمره سبع سنين واشتغل بعده باخذ العلوم النقلية والعقلية فتبحر فيها ثم ارتحل الى الدهلي فلزم العلامة البحر الفهامة مولانا الشاه ولي الله المحدث الدهلوي فسمع الحديث منه بتمامه وكماله وتفقه فيه واخذ الطريقة العالية النقشبندية اولا من شيخ الشيوخ مولانا خواجه محمد عابد السنامي ثم انسلك بخدمة الشهيد مولانا الشيخ ميرزا جانجانان مظهر واخذ منه الطريقة الاحمدية بكماله ثم رجع الى وطنه واقام به وافنى عمره الشريف في نشر العلوم وفصل الخصومات وافتاء الاسئلة والف كتبا عديدة في التفسير والفقه وغيرها تجاوز عددها من ثلاثين ولم يزل مقبلا متوجها الى الله وازديادا مجتهدا في الخيرات الى ان ادركته المنية فتوفي في غرة الرجب المرجب سنة الف ومائتين وخمس وعشرين من الهجرة (سنة ١٢٢٥) على صاحبها التحية

التزم بتصحيحه ونشره العبد الضعيف الذي افنى عمره في المعاصي والآثام المدعو بابي محمد محي الاسلام العثماني الفاني فتي عفا الله عنه وعن والديه واحسن اليهما واليه

طبع وقدم في المطبعة الموسومة بجيد برقي قرس الكائنة في البلدة الدهلي لمولانا حكيم [illegible] احمد

حمداً لله الذی امن و فقنا لطبع المجلد الثالث من الکتاب الجلیل الفخیم

الموسوم

بالتفسیر المظهری

من المائدہ

للحبر العلامة والبحر الفهامة جامع الشریعة والطریقة بیهقی الوقت علم الهدی

القاضی محمد ثناء الله العثمانی

الحنفی المظهری المجددی النقشبندی الفانی فتی المتوفی سنة ۱۲۲۵ھ

علی نفقة صاحب المعالی والمفاخر الحاج الحافظ شیخ محمد اسمعیل جیون بخش

لازالت شمس فیوضه بازغة

وقد اعتنی بطبعه واهتم بتصحیحه ونشره دائرة اشاعت العلوم

لندوة المصنفین الکائنة فی بلدة دهلی

حمداً للذي من وفقنا لطبع المجلد الثالث من الكتاب الجليل الفخيم

الموسوم

بالتفسير المظهري

للحبر العلامة والبحر الفهامة جامع الشريعة والطريقة بيهقي الوقت علم الهدى

القاضي محمد ثناء الله العثماني

الحنفي المظهري المجددي النقشبندي الفاني فتي المتوفى سنة ١٢٢٥

على نفقة صاحب المعالي والمفاخر الحاج الحافظ شيخ محمد اسمعيل جيون بخش

لا زالت شمس فيوضه بازغة

وقد اعتنى بطبعه واهتم بتصحيحه ونشره دائرة إشاعة العلوم

لندوة المصنفين الكائنة في بلدة دهلي

ط

قبلہ والد صاحب جناب قاری حق الاسلام صاحب مرحوم کی دستی تحریر کا نمونہ

۷۸۶
حامداً و مصلیاً

اعلان

یادگار حضرت شیخ الشہید سیدنا مولانا میرزا جان جاناں مظہر علوی مجددی نقشبندی دہلوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ یعنی التفسیر المظہری مصنفہ بیہقی وقت علم الہدیٰ محقق عصر علامہ مولانا القاضی محمد ثناء اللہ عثمانی حنفی مظہری پانی پتی برد اللہ مضجعہ صاحب مالابد منہ

حضرات ناظرین کرام حضرت مصنف علامؒ نے اس تفسیر کو اپنے پیر و مرشد حضرت شہیدؒ کی یادگار میں اٹھارہ سال سے زیادہ عرصہ میں مرتب کیا ہے اور اس کی ترتیب میں امور ذیل کو خصوصاً ملحوظ رکھا گیا ۱۔ حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے تمام اقوال شان نزول کے بارہ میں سلف صالحین کی تفاسیر سے نقل کیے ہیں ۲۔ اور کوئی ترکیب نحوی [illegible] تفسیر میں ملتی اور سند و متن کے اعتبار سے اس کی صحت و ضعف کو ظاہر کیا ہے ۳۔ باعتبار فقہ حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے مذاہب مع دلائل بیان کیے ہیں اور انہیں سے جو مذہب آپ کے نزدیک اقرب الی الصواب تھا اس کو ترجیح دی گئی ہے اور بعض بعض جگہ دیگر ائمہ مجتہدین کا مسلک بھی ظاہر کیا گیا ہے ۴۔ ہر آیت سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں ان کو مع دلائل بیان کیا ہے اور فروعی مسائل درج کیے ہیں ۵۔ بہت جگہ عالمانہ تحقیق کے بعد حضرات اہل باطن کے طریقہ پر آیات کا مطلب عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے ۶۔ بعض بعض جگہ اولیاء کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مکاشفات اور روحانی سیر فنا و فنا الفنا اور بقا کی تشریح کی ہے ۷۔ تحقیق کے [illegible] منصوص کو قیاس پر [illegible] ترجیح دی ہے ۸۔ قراءات عشرہ متواترہ بیان کی ہیں ۹۔ ہر مبحث پر سلف صالحین کے اقوال بکثرت نقل کیے ہیں۔

حضرت مصنف کا یہ بے بہا علمی خزانہ ڈیڑھ سو برس سے صندوقوں میں مدفون اور کیڑوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا حضرات علماء کرام اور صوفیائے عظام کا عموماً جانشینان حضرت مؤلفؒ اور متوسلین حضرت شہیدؒ کا خصوصاً فرض تھا کہ وہ اس کو صحیح ترین صورت میں منظر عام پر لائیں [illegible] سنہ ۱۳۲۲ھ میں مولوی رکن الدین صاحب [illegible]

پہلی جلد ردی کاغذ پر شائع کی تھی جو طباعت اعلیٰ اور حسن صورت کے فقدان کی وجہ سے
حضرت شہید کی یادگار کی موزوں صورت نہ تھی لیکن چونکہ پہلی سعی تھی جس نے اس کتاب کو
دنیائے علم میں روشناس کرایا لہذا وہ بھی قابل صد تحسین تھی ۱۳۱۰ھ کے قریب منشی حافظ عبد الرحمن صاحب مرحوم
مالک مطبع نظامی کانپور نے ارادہ کیا اور آدھے سیپارہ کے قریب اُن خوبیوں کے ساتھ جو
اُنکے مطبع کی خصوصیات تھیں اُسی بڑی تقطیع پر چھپوا بھی دیا مگر آگے نہ بڑھ سکے۔ کچھ عرصہ قبل
مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم نے اجازت لیکر دوسری جلد اور سورہ بقر کا کچھ حصہ اسی تقطیع کے رسمی کاغذ
پر تاجرانہ اغراض سے طبع کرایا پھر آگے نہ بڑھ سکے۔ اور بھی کئی حضرات نے عزم کیا مگر عملی قدم نہ بڑھا سکے دیگر مشکلات کے علاوہ
سب سے بڑی رکاوٹ تصحیح کا سوال تھا کیونکہ تفسیر بعد ا پچھ ضخیم جلدوں میں ہے اور اصل نسخہ بے حد بوسیدہ اور کرم
خوردہ ہو گیا ہے۔ اکثر جگہ سے غیر معمولی جدو جہد کے بعد بھی پڑھا نہیں جاتا بلکہ بعض بعض جگہ سے ٹوٹ کر جدا
محال کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ مزید طرہ یہ ہے کہ یہ اصل نسخہ بھی حضرت مولف رح کے ہاتھ کا
لکھا ہوا نہیں ہے وہ تو اصل صرف اسلئے کہتے ہیں کہ یہ حضرت مولف رح کے دستی مسودات کی پہلی
یکجائی صورت اور انکے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کو قاضی ولی اللہ مرحوم نبیرۂ حضرت
مولف نے نقل کرایا تھا اسکا کاتب عربی زبان سے نا آشنا اور قواعد رسم سے نابلد تھا اس نے
ہزاروں جگہ نادانی سے غلطیاں کیں دینی رسم کے خلاف تحریر کیا، حتی کہ قرآن پاک بھی صحیح نہیں لکھا
ہزاروں حرف چھوڑ دیے اور پھر انکو حاشیہ پر نقل کیا، صدہا جگہ عبارت دوبارہ لکھدی کئی جگہ تقدیم
و تاخیر کا تصرف کر دیا۔ تصحیح کی دشواریاں ہر شخص کو خائف کرتی تھیں

ایک مخلص صفت بزرگ کی راہ نمائی اعانت اور سرپرستی نے مجھے دلیر ارادہ کیا کہ
میں اسکو تمام و کمال شائع کروں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ میں اسکا اہل نہیں ہوں لیکن
اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے بمصداق وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ میں نے اسکا اقرار کر لیا اور اس بوجھ کو
اپنے سر پر اُٹھا لیا لیکن جب کام شروع کیا تب نظر آیا کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

صرف میرے شریک کار حضرات جانتے ہیں کہ مجھے اسکی کتنی کڑی رکاوٹوں اور کیسی کیسی
دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت شہید رحمہ کی برکت
اور حضرت مولف رحمہ کی روح کے صدقہ سے پائے عزم پر لغزش نہیں ہوئی۔ اور اب میں اسکی
اسکی پہلی جلد حسن باطنی اور جمال ظاہری کے ساتھ آپکے مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں
سنی عرعہ آوازۂ منصور کہن شد من بار دگر جلوہ دہم دار و رسن را
میں نے اس کی طباعت میں امور ذیل کا التزام یا پابندی کی ہے
~~تفسیر کی پہلی جلد آپکے مطالعہ کے لیے پیش کر رہا ہوں اسمیں~~ ۱ قرآن کی عبارت خواہ
متن [illegible] ہو یا بطور سند وغیرہ تفسیر میں لائی گئی ہو رسم عثمانی کے مطابق مع حرکات و
اعراب وغیرہ لکھائی ہے۔ اور متن کو خوب جلی لکھا کر اسپر خط کھینچ دیا ہے۔ اور ہر سورۃ کی آیات پر
[illegible] کوفی شمار مسلسل ڈالدیا ہے تاکہ حوالہ دینے میں آسانی ہو۔ ۲ تفسیر کی عبارت جو
قدیم صحیح رسم الخط [illegible] ۔ اور جدید طریقہ اکثر کے موافق لکھائی ہے ۳ کاتبوں نے
متن کے بعض الفاظ چھوڑ دیے تھے اور بعض کو غلط لکھدیا تھا انکو صحیح درج کیا ہے۔ تفسیر کے
اندر جو آیتیں بطور استشہاد و حوالہ لائی گئی ہیں انمیں بھی بعض جگہ تغیر تھا، انکو بھی عموماً صحیح لکھا گیا ہے
اور حاشیہ پر حوالہ دیدیا ہے۔ بعض آیات کے درمیان کا حصہ چھوٹا ہوا تھا اسکو حاشیہ پر لکھدیا گیا ہے
۴ لفظی اور نحوی غلطیوں کی [illegible] درستی کرکے حاشیہ پر اشارہ کر دیا ہے۔ ۵ املا کی
لغزشوں کی صحت کی ہے مگر اسکا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ مثلاً ھاتین ہر جگہ ذاتین کو بالیاء ذکریا کو
اصل قلمی نسخہ میں واو متطرفہ کے بعد الف غلط
بالالف اکثر ذوات الواو افعال و اسماء کو بالیاء لکھا تھا ۶ ذوالف کلمات کو بعض جگہ
بالف اور بعض جگہ بحذف الف لکھا تھا اسمیں ہر جگہ باثبات الف درج ہیں ۷ کاتب نے [illegible]
بعض جگہ دو کلموں کو موصول لکھا تھا اسمیں انکو مقطوع لکھا گیا ہے ۸ حضرت مصنف رحمہ نے قراءت عشرہ
سبعہ کا التزام کیا تھا کاتب نے اکثر جگہ سے بعض ائمہ رحمہم کا نام چھوڑ دیا تھا انکو بین السطور میں
یا حاشیہ پر لکھا کر بے دستخط کر دیے ہیں اور جہاں نفس مسئلہ میں غلطی تھی اسکو حاشیہ پر صحیح کر دیا ہے
۹ حاشیہ پر تین قسم کے مضامین درج تھے حضرت مولانا شاہ عبد العزیز برادر مصنف کے

ایراد بعد انکے - بعض الفاظ کے معنی - مضامین تفسیریہ کی تائید میں بعض آثار و احادیث

انکا بیشتر حصہ قریب قریب ضائع ہو گیا تھا۔ طبع اول کے ناشروں نے بعض کو نقل کیا ہے

اور بعض کو قطعاً چھوڑ دیا۔ اسمیں (یعنی ایراد بعد کے جواب) سوا ایک حرف

بھی باقی تھا رب کو بڑی جد و جہد سے صحیح نقل کرایا ہے اور کوئی لفظ بغیر پڑھے درج نہیں کیا

بشری قوت کے مطابق صحت کی سعی کی ہے اور اپنے

دو مرتبہ اصل سے ایک مرتبہ ہمارے نسخہ سے ایک مرتبہ حضرت جد بزرگوار مولانا

قاضی عبد السلام نبیرۂ حضرت مولف کے مطالعہ کردہ نسخے سے اور دو مرتبہ اپنی

طبیا کردہ نقل سے مقابلہ کروایا گیا کہ [illegible] پروف کا اصل سے مقابلہ کرا کر

طبع کرایا ہوا۔ اگر اب بھی کوئی غلطی پائی جائے تو اسکا باعث مرتب فرو مایگی العلم فہمی

حضرت مولف رح کی ذات گرامی اس سے پاک ہے۔

ان خوبیوں کے علاوہ بہترین کاتب سے کتابت کرائی ہے ۲۸ پونڈ کا چکنا

کاغذ استعمال کیا ہے - بڑی تقطیع کو اکثر حضرات ناپسند کرتے تھے لہذا سائز ۲۹×۲۲/۸ رکھا ہے

قابل اعتبار مطبع میں طباعت کرائی ہے - یہ جلد تقریباً ایک ہزار صفحات میں پوری

ہوئی ہے - غیر مجلد کا ہدیہ پانچ روپے مقرر کیا گیا ہے کل کتابیں یکمشت لینے والوں کی

خدمت میں ایک جلد مفت بھیجی جائیگی تاجران کتب

اور غیر مستطیع طلبا سے بشرط تصدیق خاص رعایت ہوگی ایک کتاب کا وزن ۱۲ پونڈ

کے قریب ہے لہذا بذریعہ ریل منگانے میں خرچ کم پڑیگا۔ ڈاکخانہ سے منگانے والے حضرات وی

پی کا خرچ بعد ریل سے منگانے والے کل قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں

اسکے بغیر تعمیل دشوار ہے - چند جلدیں نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر چھپوائی گئی ہیں تاکہ روسا کے کتب خانوں کی

زینت بنیں انکا ہدیہ دس روپے ہے - دوسری اور تیسری جلد ونکی تصحیح کا کام جاری ہے

کامل کتاب کی اشاعت کیلیے یہ ضروری ہے کہ یہ جلد بہت جلد شائقین تک پہنچ جائے۔ متوسلین حضرت شہید

حضرات صوفیہ، علماء کرام اور علم دوست روساء کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اسکی اشاعت میں مدد فرمائیں

کسی نے حضرت مرزا صاحبؒ سے پوچھا "کیا حضور کو ازروئے کشف قاضی صاحب کے آنے کی خبر ہو جاتی ہے جو حضور ان کے واسطے جگہ خالی کرا لیتے ہیں"۔ فرمایا "نہیں' جب میں دیکھتا ہوں کہ فرشتے تعظیماً" کھڑے ہونے لگے ہیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ قاضی صاحب آتے ہیں اور ان کے لیے جگہ خالی کرا دیتا ہوں"۔

حضرت قاضی صاحبؒ اس مرتبہ کے فقیہ تھے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ آپ کو بیہقی وقت کہا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ قاضی صاحب تقویٰ و پرہیزگاری اور اتباع سنت میں اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیوں) میں سے ایک آیت (نشانی) ہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت شاہ صاحبؒ سے صحابہ کرامؓ کی سیرت کے بارے میں سوال کیا۔ فرمایا' تأمل کرو۔ تمہیں مثال دکھاؤں گا۔ ایک روز حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس وعظ و تذکیر میں قاضی صاحبؒ موجود تھے۔ شاہ صاحبؒ نے آپ کی طرف اشارہ کر کے سائل کو بتایا کہ صحابہؓ ایسے ہوتے تھے۔ قاضی صاحبؒ نے تفسیر مظہری چھ ضخیم جلدوں میں تقریباً چار ہزار بڑے سائز کے صفحات پر تحریر فرمائی۔ آیات کی تفسیر میں احادیث پر انحصار کیا اور ہر حدیث کی درجہ بندی بااعتبار فنِ حدیث فرمائی۔ جب سے یہ تفسیر شائع ہوئی ہے مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر میں یکساں مقبول و محترم ہے۔ ایک طرف سرخیل علماء دیوبند حضرت مولانا محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" کو تمام و کمال تفسیر مظہری سے ماخوذ فرمایا' دوسری طرف بریلوی فکر کے علماء کے مستند امام حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں حضرت قاضی صاحب کا ذکر انتہائے احترام و محبت سے کیا ہے۔ حضرت کی زندگی میں بھی اور حضرت کے بعد بھی بعض علم دوست حضرات نے تفسیر کی قلمی نقول تیار کرائیں' لیکن عرصہ دراز تک کسی کو مکمل تفسیر طبع کرانے کی سعادت حاصل نہ ہوئی۔ حضرت کے انتقال کے بعد دو پشتوں تک حضرت کا کتب خانہ محفوظ رہا' لیکن پھر خاندان مخدوم کبیر الاولیا کی اس شاخ میں وہ شمع علم گل ہوگئی جو حضرت کے صاحبزادے خواجہ محمد ابراہیمؒ کے زمانے سے روشن چلی آتی تھی۔ کتب خانہ نااہل اور قدر ناشناس ہاتھوں میں پڑ کر

تقریباً تباہ ہوگیا۔ اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں' جو باقی بچیں انہیں کیڑے کھانے لگے' انہی میں وہ بے بدل تفسیر بھی شامل تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے علم کی اس مشعل کا وارث ابا جان کو کیا تو خاندان کے کسی بزرگ نے ان کی توجہ اس کام کی طرف دلائی۔ خود ابا جان لکھتے ہیں "ایک خضر صفت بزرگ کی راہ نمائی' اعانت اور سرپرستی نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اس کو تمام و کمال شائع کروں"۔ بس پھر وہ اس دھن میں لگ گئے۔

کام شروع کیا تو مشکلات کا اندازہ ہوا۔ تفسیر کی ضخامت کے علاوہ نسخہ کی بوسیدگی ہمّت شکن تھی۔ بعض جگہ سے پڑھنا محال ہوچکا تھا۔ مزید طرّہ یہ کہ "اصل" نسخہ بھی حضرت محدثؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں تھا' بلکہ یہ وہ نسخہ تھا جسے حضرت محدثؒ کے نواسہ نے کسی ایسے کاتب سے نقل کرایا تھا' جو "عربی زبان سے ناآشنا اور قواعد رسم و تحریر" سے نابلد تھا۔ اس نے ہزاروں جگہ نادانی سے غلطیاں کر دیں' حتیٰ کہ قرآن پاک بھی صحیح نہیں لکھا' ہزاروں مقامات پر الفاظ چھوڑ دیے' جنہیں حاشیہ پر نقل کیا۔ صدہا جگہ عبارات دوبارہ لکھ دیں' کئی جگہ تقدیم و تاخیر کا تصرف کر دیا۔

میں اپنے بارہ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابا جان کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس زمانہ میں وہ اس تفسیر کی تسوید و تصحیح میں مصروف تھے۔ بڑے دالان کے کمانچہ میں چار تخت جوڑ کر بچھائے گئے تھے۔ ان سے ایک قسم کی وسیع شاہ نشین یا سٹیج بن گیا تھا' اس پر دری کے اوپر چٹی سفید چاندنیوں کا فرش لگا ہوتا تھا اور ابا جان کا گاؤ تکیہ' پانوں کا خاصدان اور اگالدان رکھے ہوتے تھے۔ ابا جان نیم استادہ ہو کر لکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ نفیس ترین سیاہ روشنائی اور اعلیٰ درجہ کا قلم اور کاغذ استعمال کرتے تھے۔ لکھائی چھوٹی چھوٹی' نہایت صاف اور خوبصورت تھی' اگر پڑھنے والا نفس مضمون سے واقف ہو تو پڑھنے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ جوان بیٹے بیٹی کے انتقال کے صدمہ سے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا لیکن پورا ہاتھ ٹکا کر لکھتے تھے تو تحریر میں رعشہ کا اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ صبح سے لے کر رات

گئے تک وہ اسی کام میں منہمک رہتے تھے۔ احادیث اور روایات کی وہ تمام کتابیں جمع کیں جن سے تفسیر کی تسوید میں مدد لی جا سکتی تھی۔ جب کام کرتے تھے تو گرد و پیش کتابوں کا حصار بن جاتا تھا' جو الفاظ و عبارات ضائع ہوگئے تھے ان کے ماخذ تلاش کیے جاتے تھے۔ ابا جان کے شاگرد خاص ان کی اعانت کرتے تھے اور جب تک احادیث کے مجموعوں میں وہی عبارت یا روایت لفظ بلفظ نہ مل جاتی تھی' جس کی تصحیح مقصود تھی' تلاش جاری رہتی تھی۔ اس طرح برس ہا برس کی کاوش اور جانکاہی کے بعد پوری تفسیر کا مسودہ مکمل کیا۔

حضرت محدثؒ نے تفسیر مظہری میں نہ صرف مضامین تفسیر و فقہ بیان فرمائے ہیں بلکہ اس میں تصوف' قرأت اور قواعد رسم قرآنی سے بھی بحث کی ہے اور میرے علم کے مطابق اس بے بدل تفسیر کی حیات نو کے لیے اس وقت پورے برصغیر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف تھانویؒ اور میرے ابا جان کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اہل نہیں تھا اور چونکہ حضرت حکیم الامتؒ اپنے رشد و ہدایت اور تعلیم و تصنیف کے کام میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں اس کام کی مہلت کا ملنا ممکن ہی نہیں تھا (اگرچہ انہیں بھی اس کی ضرورت کا شدید احساس تھا اور اس کی شدید خواہش تھی) اس لیے گویا ابا جان ہی کی ہستی تھی جس سے یہ عظیم کارنامہ ممکن ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اور حضرت محدثؒ کا روحانی تصرف تھا کہ یہ کام ہو سکا۔

تفسیر کا مسودہ سات ضخیم جلدوں میں تیار ہوا۔ (اور اس کی غالباً دو یا تین نقول تیار کی گئیں) ان میں سے پہلی' دوسری اور پانچویں جلد نہایت اہتمام کے ساتھ اور بہت نفاست سے شائع کرا چکے تھے کہ جنگ عظیم شروع ہوگئی اور جنگ کے سبب سامان طباعت اتنا گراں ہوگیا کہ کام ملتوی کرنا پڑا۔ تسوید و طباعت کا کام شروع کرنے سے پہلے نظام دکن کی حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ طبع شدہ جلدوں کی ایک معقول تعداد خرید کر اس کار خیر میں عملی معاونت کی جائے گی اور اس معاہدہ کے سبب تفسیر کے سرورق پر نظام دکن کا نام طبع کرایا گیا تھا' لیکن مجھے جہاں

تک علم ہے اس معاہدہ کی تکمیل نہیں کی گئی اور یوں یہ تمام بوجھ ابا جان کے ذاتی وسائل پر پڑا اور بصد حسرت و افسوس کام بند کرنا پڑا۔

جنگ کے خاتمہ پر دلی کے ایک تاجر شیخ اسماعیل جاپان والے نے ابا جان کے استاد حضرت مولانا اری حاجی اسحاق صاحبؒ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک معقول رقم کسی ایسے کارخیر میں لگانا چاہتے ہیں جس کی حضرت حاجی صاحبؒ تعیین فرمائیں۔ حضرت موصوفؒ کی بھی دلی خواہش تھی کہ کوئی صورت تفسیر مظہری کی ملتوی شدہ اشاعت کی تکمیل کی پیدا ہو۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سیٹھ کو اپنے فرزند قاری محمد یوسف کے ساتھ پانی پت روانہ کیا۔ یہ قاری محمد یوسف صاحب وہی بزرگ ہیں جو ہر جمعہ کو آل انڈیا ریڈیو دلی سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے اور ان کے مسحور کن حسنِ صوت پر تمام ہندوستان وجد کرتا تھا۔ مجھے جہاں تک یاد ہے قاری صاحب کی معیت میں سیٹھ اسماعیل دو یا تین بار پانی پت آئے اور ابا جان نے اپنے استاد کی منظوری سے چند شرائط پر مکمل مسودہ' جو ان کی پوری زندگی کی کاوش کا نتیجہ تھا' بخوشی سیٹھ کے حوالہ کر دیا۔ شرائط یہ تھیں کہ سیٹھ تفسیر کو اسی شان و اہتمام سے شائع کرائیں گے جس طرح تین جلدیں خود ابا جان نے طبع کرائی تھیں۔ سرورق پر مرتب و مصحح کے طور پر ابا جان کا نام باقی رہے گا' تاکہ علما و طلبا انہیں دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ تفسیر کو کسی طور پر بھی تجارتی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے گا۔ سرورق پر جہاں نظام دکن کا نام درج ہے اس جگہ پر سیٹھ صاحب کا نام درج کر دیا جائے گا۔ ابا جان نے کسی قسم کا معاوضہ یا حق المحنت لینے سے انکار کر دیا' البتہ طبع شدہ جلدوں پر جو حقیقتاً خرچ آیا تھا وہ سیٹھ ابا جان کو ادا کر دیں گے اور جو واجبات مطبع وغیرہ کے ابھی تک واجب الادا تھے وہ ادا کر کے تمام طبع شدہ جلدیں وصول کر لیں گے۔ افسوس کہ سیٹھ صاحب نے اس معاہدہ کی پابندی جیسا چاہیے تھا نہ کی۔ نہ صرف یہ کہ کتابت و طباعت کا معیار حد درجہ پست کر دیا' بلکہ ابا جان کا نام ہی سرورق سے بالکل اڑا دیا اور آج اہلِ علم کو باستثناء شاذ و نادر یہ بھی علم نہیں کہ

یہ بے بدل تفسیر کیونکر حیات نو حاصل کر پائی۔

ابا جان کو اس عہد شکنی کا اتنا صدمہ تھا کہ انہوں نے وہ رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا' جو ان کی واجب الادا تھی' لیکن سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر اس واقع کا کبھی اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔

ابا جان کا قرآن پڑھنے کا انداز انتہائی دلکش اور دلنشین تھا۔ قطع نظر اس سے کہ علمِ قرأت میں مقامِ امامت حاصل تھا' قدرت نے آواز بہت خوبصورت عطا کی تھی۔ گویا اللہ نے انہیں لحن داؤدی میں سے ایک حصہ عطا فرمایا تھا۔ رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن سنایا کرتے تھے۔ جوانی میں عموماً دو جگہ پڑھتے تھے' پہلے اپنے ماموں کی مسجد میں سپارہ سناتے تھے پھر اپنے شاگرد قاری شیر محمد صاحب کے مدرسہ میں جو چول خاں دروازہ کے قریب واقع تھا اور جس کا نام قاری صاحب مرحوم نے اپنے مرشد روحانی حضرت حکیم الامتؒ کے نام پر مدرسہ اشرفیہ رکھا تھا۔ میرے دیرینہ رفیق حافظ صغیر احمد خان شیروانی نے (جن کے والد حافظ بشیر احمد شیروانی مرحوم ابا کے دوست تھے) نہایت ثقہ راویوں کے حوالہ سے بیان کیا کہ ابا جان اپنی جوانی کے زمانہ میں حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے مزار مبارک سے ملحق مسجد میں سات شب میں قرآن کریم سنایا کرتے تھے اور ان کے بعد ان کے برادر عمراد حافظ قاری محمد ابراہیم صاحب نے یہ منصب سنبھالا۔ میرے علم میں یہ بات نہ تھی۔حافظ ابراہیم موصوف کا ذکر آگے آتا ہے۔

باجی سناتی ہیں کہ جب جوان بیٹے محمد مدنی کا انتقال شعبان ۱۳۴۶ھ (فروری ۱۹۲۸ء) میں ہوگیا تو اماں جان نے اصرار کیا کہ مسجد میں قرآن سنانے کے بعد آپ گھر میں آکر سنائیں گے' تاکہ مجھے سکون ہو۔ ابا جان بہت مضطرب تھے۔ ایک طرف بیوی کے دل کی حالت کا احساس تھا' دوسری طرف اپنے عزیز شاگرد قاری شیر محمد کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ قاری شیر محمد صاحب نے اماں جان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ آپا جان مجھے میری تقدیر کی اس سعادت سے محروم نہ کیجئے' میں خود آپ کے لیے

اتنے قرآن کے پڑھنے والے بھیجوں گا کہ تمام رات آپ کو کلام اللہ سنایا جائے گا۔ سو اس سال کے رمضان میں یہی انتظام رہا کہ ابا جان نے حسب معمول دونوں جگہ قرآن سنایا اور قاری شیر محمد صاحب کے شاگردوں نے اماں جان کو تراویح پڑھوائیں۔ سچ ہے اللہ کے کلام سے زیادہ کوئی چیز بھی زخمی دل کو ڈھارس نہیں بندھاتی۔ خود قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "سن لو اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے"۔ افسوس کہ اگلے رمضان سے پہلے ہی قاری شیر محمد صاحبؒ بھی اپنے استاد کو داغ مفارقت دے گئے اور ابا جان کو ایک اور جانکاہ صدمہ سہنا پڑا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا ہے تو ابا جان صرف گھر میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ روزہ کھول کر کچھ دیر استراحت فرماتے تھے اور پھر دونوں میاں بیوی نماز پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ابا جان امامت کرتے تھے اور اماں جان اور بھابھی جان مقتدی ہوتی تھیں۔ ہم بھائی جب اپنی اپنی محراب سنا کر واپس آتے تھے تو ابا جان ابھی پڑھتے ہوتے تھے۔ میرے پاس الفاظ نہیں بلکہ الفاظ میں وسعت بیان نہیں کہ میں ان کے پڑھنے کی کیفیت کی نقشہ کشی کر سکوں۔ رات کے سکوت میں ان کی تلاوت کی شیرینی ایک روحانی سحر کا اثر رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کائنات اپنے مرکز پر ساکن ہوگئی ہے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

پانی پت میں رمضان کے آخری عشرہ میں "**شبینوں**" کا دستور تھا۔ یعنی حفاظ عشاء سے لے کر سحر تک تلاوت کلام پاک' نوافل یا تراویح کی نیت باندھ کر کیا کرتے تھے اور سننے والے حسب ہمّت و شوق اقتداء میں نیت باندھ کر یا صرف بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ حفاظ صاحبان اپنے حوصلہ اور ہمت کے مطابق ایک سپارہ سے لے کر پندرہ سپارہ تک دو رکعات میں پڑھ لیا کرتے تھے' لیکن بعض مشہور **شبینوں** میں دستور ایک ہی سپارہ پڑھنے کا تھا۔ ابا جان بھی اپنے عقیدت مندوں کے اصرار پر نصف شب کے بعد اپنی تراویح سے فارغ ہو کر کہیں کہیں شریک ہوتے تھے۔ جب ان کے پڑھنے کی باری آتی تھی تو سننے والے پرے باندھ کر سنتے تھے۔ مقتدیوں کی

صفیں بن جاتی تھیں' ان کا معمول تھا کہ ایک سپارہ روایت قالون میں پڑھتے تھے۔ ان کی آواز کی شیرینی' روایت قالون کا اپنا حسن' قرآن کے کلمات کی عظمت' آخر شب کا سماں' رمضان کی برکت' بس کیا کیفیت بیان کروں۔ آج بھی کچھ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے ان کا پڑھنا سنا تھا' کہتے ہیں چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی یاد کرتے ہیں تو سرور کی ٹھنڈک روح کی گہرائیوں تک محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۸۸ء میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کراچی میں پیر الٰہی بخش کالونی میں جا کر ٹھہرا اور مغرب کی نماز کے لیے گھر کے قریب ہاشمی مسجد میں چلا گیا۔ قاری صاحب نے نماز میں تلاوت کی تو دل تڑپ اٹھا۔ آواز کانوں سے اتر کر روح میں بستی چلی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ آہنگ کب اور کہاں سنا تھا۔ بڑے اشتیاق سے عشاء کی نماز میں شریک ہوا۔ امام صاحب نے نسبتاً کچھ طویل تلاوت کی اور میں اس لطف و سرور کا منبع تلاش کرتا رہا' جو مجھے حاصل ہو رہا تھا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ تلاوت کا یہ انداز میں نے مسجد نبویؐ میں سنا تھا لیکن پوری طرح دل مطمئن نہ ہوتا تھا۔ اس رات محض اس خیال سے سو نہ سکا کہ ایسا نہ ہو میری آنکھ نہ کھلے اور فجر کی جماعت نکل جائے۔ علی الصبح اذان سے پہلے ہی مسجد کی طرف چل پڑا' حالانکہ ابھی مسجد کے دروازے مقفل تھے۔ نماز فجر میں امام صاحب نے سورۃ بقرہ کی آیات تلاوت فرمائیں اور میں اس تلاوت کے سحر میں کھویا رہا۔ اس روز مغرب کی نماز میں انہوں نے سورۃ الناس پڑھی تو ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ مجھے ابا جان نے قرآن تو نہیں پڑھایا' لیکن آخری پاؤ سپارے کی مشق کئی بار کرائی تھی۔ یہ تلاوت کا انداز بالکل ان کا سا تھا اور لحن یا حسن صوت میں بھی بہت مشابہت تھی۔ ان کی وفات کے پینتیس (۳۵) برس بعد ان کی آواز کی جھلک سنائی دی۔ نماز پڑھ کر نکلا تو امام صاحب وضو خانہ کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ بے تابانہ ان کے پاس گیا' مؤدبانہ سلام کر کے بیٹھ گیا اور ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے تلاوت کا یہ آہنگ کہاں سے سیکھا۔ بولے میں دیوبند کا فارغ التحصیل ہوں۔ میں کچھ مایوس ہوگیا۔ عرض کیا دیوبند کی فضیلت علمی تو

مسلم ہے' لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہاں تعیم تجوید و قرأت کی کوئی روایت نہ تھی' بلکہ دیوبند سے طلباء تحصیل تجوید و قرأت کے لیے پانی پت آیا کرتے تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور فرمایا پانی پت میں ایک امام القراء ہوا کرتے تھے' قاری محی الاسلام' میں نے ان سے تجوید و قرأت پڑھی ہے اور میں قاری فتح محمد صاحبؒ کا ہم سبق اور ہم عصر ہوں۔ میں نے عرض کیا' میں قاری محی الاسلام کا سب سے ناخلف اور سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ مولانا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے بے ساختہ مجھے گلے سے لگا لیا' بولے آپ نے آج کیا یاد دلا دیا۔ ان کا نام قاری سیف اللہ نیازی ہے اور اُن دنوں وہ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی کی مسجد ہاشمی میں پیش امام ہوا کرتے تھے۔

تلاوت قرآن میں دو عوامل ہوتے ہیں۔ اول صحت مخارج و حرکات یعنی ہر حرف کو اس کے صحیح مقام سے ادا کرنا اور زبر' زیر' پیش' تشدید' مد' الف' واؤ اور ی کو صحیح اور مکمل طور پر ظاہر کرنا' دوسرے حسن آواز۔ پہلی چیز صحیح تعلیم اور پرخلوص مشق سے حاصل ہوتی ہے' جبکہ دوسری چیز خداداد ہے۔ ابا جان کی تعلیم کے بارے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ انہیں ائمہ وقت سے شرف تلمذ حاصل رہا' پھر خدا نے ذاتی صلاحیت سے بدرجہ اتم نوازا تھا۔ ساتھ آواز اس قدر خوبصورت اور شیریں تھی کہ سننے والا مبہوت رہ جاتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں میں نے تین قسم کے طالبین دیکھے۔ ایک وہ جنہیں فن ادائیگی بھی حاصل ہوگیا اور اپنے استاد کے انداز اور حسن صوت کی بھی ایک حد تک مشق ہوگئی۔ ان میں قاری شیر محمد صاحبؒ' میرے مرحوم بھائی محمد مدنی وغیرہ شامل تھے۔ دوسرے وہ جنہوں نے حسن صوت کے حصول کو ناممکن پا کر صرف حصول فن پر توجہ کی' ان میں قاری فتح محمد صاحبؒ مشہور ہوئے' تیسرے کچھ ایسے نادان بھی تھے جنہوں نے اصل فن کو تو نظرانداز کر دیا' صرف لب و لہجہ اور آواز کی نقل پر وقت اور محنت صرف کی۔ ان میں ایک بہت مشہور ملا ہوا کرتے تھے' جن کا اصل نام تو مجھے یاد نہیں لیکن عرف عام میں "ملا بیگی" کہلاتے تھے۔

انہیں قرآن کا ایک حرف بھی صحیح پڑھنا نہیں آتا تھا' لیکن ابا جان کی آواز کی نقل ہوبہو اتار لیتے تھے۔ ان ملا جی کو اس پر بہت ناز تھا' فخریہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں وہ نہیں حاصل کر سکا جو قاری فتح محمد صاحب نے حاصل کر لیا' تو وہ بھی اس حسن آواز کے حاصل کرنے سے محروم رہے' جو میں نے حاصل کر لی ہے۔ ابا جان انہیں بہت سرزنش کرتے تھے' لیکن ملا بیگی پر ذرا اثر نہ ہوتا تھا۔ اہل علم کے مجمع میں تو پڑھنے کی جسارت نہ کرتے تھے' لیکن ناواقفوں کے سامنے یہ کہہ کر پڑھا کرتے تھے کہ میں بڑے قاری صاحب کی ہوبہو نقل ہوں۔ ایک واقعہ بڑے فخر سے بیان کرتے تھے کہ ایک رات میں مسجد میں تنہا تلاوت کر رہا تھا۔ سلام پھیر کر دیکھا تو حضرت مولانا عبدالحلیم انصاری صاحب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: میاں ملا بیگی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں گلی میں سے گزر رہا تھا کہ کان میں بڑے قاری صاحب کے تلاوت کرنے کی آواز پڑی تو میں کشاں کشاں کھنچا چلا آیا' آکر دیکھا تو تم پڑھ رہے تھے۔

ابا جان کا لڑکپن جس ماحول اور جن حالات میں گزرا ان میں ان کا کچھ بھی بن جانا ایک محال امر تھا۔ کجا کہ اتنا بڑا عالم و امام بن جانا' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں وہ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے' پھر ہمارے دادا جان نے کبھی گھر بسایا ہی نہیں' نہ کبھی ایک جگہ قیام کیا۔ ابا جان ننھیال میں پلے۔ ان کے نانا ماموں بڑے زمیندار اور بااثر لوگ تھے۔ ماں کو بیٹے سے ازحد پیار تھا' کسی کی مجال نہ تھی کہ اف کہہ سکے۔ کھیل کود کی کھلی چھٹی تھی۔ مکان کے پچھواڑے ایک وسیع احاطہ میں رعیتی مکانات تھے' جہاں بہت سے خاندان آباد تھے' ان کے لڑکے بالے سب ابا جان کے حکم کے پابند تھے۔ پھر ماموں کے کئی بیٹے تھے' وہ سب بھی ابا جان کو لیڈر تسلیم کر چکے تھے' لہٰذا سارا دن کھیل کود اور فضول مشاغل میں گزرتا تھا۔ ان حالات میں اگر رئیس زادوں کی طرح بگڑ جاتے اور کبوتر بازی' مرغ بازی' پتنگ بازی جیسے تباہ کن شوق اختیار کر لیتے تو کیا تعجب تھا' لیکن اللہ نے انہیں دوسرے ہی مقصد کے لیے پیدا فرمایا' ان کی تعلیم و تربیت میں ان کی فطری سعادت کے علاوہ ان کی پھوپھی کا بڑا ہاتھ تھا'

جن کا نہ اپنا کوئی بیٹا تھا نہ نواسہ اور جنہوں نے بالآخر اپنی اکلوتی نواسی ان سے بیاہ کر ابا جان کو تا زندگی اپنے ساتھ ہی رکھا۔

لڑکپن ہی سے ابا جان نہایت ذہین' فطین اور دلیر تھے۔ ہر قسم کے مردانہ کھیلوں میں حصہ لیتے تھے اور اپنے ساتھیوں کے مسلمہ سردار اور کپتان تھے۔ ان کی دلیری کے بہت سے واقعات اماں جان بیان کرتی تھیں۔ سب سے حیرت ناک وہ دو واقعات ہیں جب ان کا سامنا جنات سے ہوا اور اگر میں نے انہیں اماں جان جیسی ثقہ' پارسا اور عابد و زاہد خاتون سے نہ سنا ہوتا تو مجھے یقین کرنے میں تأمل ہوتا۔ نوجوانی کے زمانہ میں ابا جان نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اپنے ماموں کے گھر سے ملحق ایک ویران کمرہ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ سب دوست مل کر یہاں مطالعہ بھی کرتے تھے اور گپ شپ بھی۔ ان کی غیر حاضری میں کمرہ مقفل رہتا تھا اور صرف دو دوستوں کے پاس اس قفل کی چابی تھی۔ ایک ابا جان کے اور دوسرے کا نام مجھے یاد نہیں۔ روزانہ جب وہ لوگ صبح کو کمرہ کھولتے تو اپنی کتابوں اور سامان کو بے ترتیب پاتے' دونوں دوست ایک دوسرے کو الزام دیتے کہ چونکہ چابی صرف تمہارے پاس ہے' اس لیے ضرور تم ہماری غیر حاضری میں یہاں آتے ہو اور جاتے ہوئے چیزیں واپس ان کی جگہ پر نہیں رکھتے۔ دونوں ہی پوری شدت سے اس الزام کی تردید کرتے' لیکن بظاہر اس کے علاوہ کمرہ کے یوں بے ترتیب ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ ایک روز ابا جان نصف شب کے قریب ادھر سے گزر رہے تھے تو دروازہ کی درزوں سے چھن چھن کر روشنی باہر پڑتی نظر آئی' انہیں یقین ہوگیا کہ آج چور پکڑا جائے گا' لہٰذا دبے قدموں کمرہ کے دروازہ تک آئے اور مقفل دروازہ کی درزوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک سفید ریش اجنبی کو تپائی پر جھکے ہوئے کتاب پڑھتے پایا' بہت حیران ہوئے اور آہستہ سے قفل کھول کر ایک دم دروازے کے پٹ کھول دیے۔ وہ اجنبی چونک کر کھڑا ہوگیا اور اس کا وجود پھیلنا شروع ہوا تو اس کا سر چھت سے جا لگا' پھر اس نے اور کئی صورتیں بدلیں لیکن ابا جان بے خوف دہلیز پر کھڑے اس کی حرکتیں دیکھتے

رہے' آخر وہ اجنبی اپنی پچھلی حالت پر واپس آگیا اور کہنے لگا "نوجوان' میں قوم جنات سے تعلق رکھتا ہوں اور یہ کمرہ مدت سے میرے استعمال میں ہے۔ اب تم لوگوں کے یہاں بیٹھنے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے' لہٰذا تم لوگ اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لو"۔ سو ابا جان اور ان کے دوستوں نے وہ کمرہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس کمرہ کو کسی نے نہیں کھولا۔ میرے لڑکپن میں اس کا دروازہ بدستور مقفل تھا' لیکن چھت گر چکی تھی' کئی بار ہم دوستوں کا جی چاہا کہ اس تاریخی کمرہ کو اندر سے دیکھیں لیکن حوصلہ نہیں پڑا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ ایک بار انہوں نے خود جنات کو قابو کرنے کا عمل کیا۔ جب اپنے استاد اور مرشد سے یہ خواہش ظاہر کی تو انہوں نے بہت منع کیا کہ صاحبزادے اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں' اول تو جنات کو قابو کرنا ہی جان جوکھوں کا مرحلہ ہے اور اگر بالخصوص وہ قابو میں آ بھی جائیں تو تمام عمر خود عامل کو ایسی قیود برداشت کرنا پڑتی ہیں' جن سے زندگی بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے' لیکن جوانی کے جوش میں مرشد کی نصیحت نہ مانی اور اپنی ضد پر اڑے رہے' آخر مرشد نے عمل بتایا اور مکمل رازداری کی تاکید کی۔ ابا جان مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت بدرالدین بدر عالم شہیدؒ کے مزار سے ملحق قبرستان میں شکستہ قبروں کے بیچ میں ایک حصار کھینچ کر اس کے اندر بیٹھ گئے اور عشاء کے وقت سے سحر تک وظیفہ پڑھنے لگے' یہ عمل چالیس شب کرنا تھا۔ رات کی ویران تنہائیوں اور قبرستان کے وحشت ناک ماحول میں جانا ہی کچھ کم حوصلہ کی بات نہیں ہے' لیکن مسلسل تمام رات اور چالیس راتوں تک اس قسم کا مشغلہ غیر معمولی دلیری اور قوت ارادی کو ظاہر کرتا ہے۔ ادھر دوستوں کی محفل سے جو یوں یکایک غائب ہوئے تو سب کو کرید لگی۔ دن میں ملتے تھے تو احباب یوں غائب ہو جانے کا سبب پوچھتے تھے' لیکن کچھ جواب نہ ملتا تھا۔ آخر ایک روز سب نے فیصلہ کیا کہ پیچھا کیا جائے' تاکہ معلوم ہو کہ محی الاسلام کس شغل میں لگے ہیں' چنانچہ ٹوہ لگاتے لگاتے قبرستان تک پہنچ گئے۔ اب دوستوں نے ڈرانے کا فیصلہ کیا' چنانچہ وہ آس پاس کی قبروں کے پیچھے چھپ گئے۔ پہلے ایک نوجوان نے دیا

سلائی جلائی اور یکدم قبرستان کی تاریکی میں شعلہ نمودار ہوگیا۔ پھر دوسرے دوست نے' پھر تیسرے نے' غرض قبروں کے پیچھے سے شعلے اٹھتے اور بجھتے رہے۔ ابا جان سہمے تو بہت لیکن حصار کی حفاظت اور مرشد کی قوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ عمل جاری رکھا۔ مرشد کی طرف سے ہدایت تھی کہ شب کے دوران جو کوائف پیش آئیں مجھ سے بیان کرنا۔ سو اگلے روز یہ واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت نے سن کر فرمایا' یہ انسانوں کی حرکت ہے' جنات کی نہیں۔ انتالیسویں شب کی سحر کو جب گھر واپس آ رہے تھے تو سنسان بازار میں مویشیوں کا ایک ریوڑ نظر آیا۔ بڑے حیران ہوئے کہ اتنی صبح سویرے اتنے جانور بازار میں کہاں سے آ گئے۔ سوچا کوئی چرواہا ریوڑ جنگل لے جا رہا ہوگا' قریب پہنچے تو ایک ایک کر کے وہ مویشی ان کی طرف یوں بڑھے جیسے ٹکر مارنا چاہتے ہوں۔ ابا جان اپنی جگہ استقامت سے کھڑے ہوگئے اور آیات قرآنی تلاوت کرنا شروع کر دیں۔ ہر جانور حملہ کرنے کے لیے آتا تھا' لیکن قریب پہنچ کر کنی کترا کر نکل جاتا تھا' جب راستہ صاف ہوا تو سیدھے مرشد کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے سن کر فرمایا یہ وہی چالیس جنات ہیں جو تمہارے حکم میں آ جائیں گے' اگر آج کی رات تم نے خیر سے گزاری۔

چالیسویں شب کو حسب معمول عمل پڑھ رہے تھے کہ مسافروں کا ایک قافلہ مزار سے ملحق مسجد میں آ کر اترا جو ابا جان کے بالکل سامنے تھی۔ قافلے میں سب کی سب عورتیں تھیں' جو تعداد میں چالیس تھیں اور ہر ایک کی گود میں ایک بچہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک عورت بولی بھوک لگی ہے۔ دوسری نے کہا لو میرا بچہ کھا لو' چنانچہ سب نے بوٹی بوٹی نوچ کر بچہ کو کھا لیا' پھر بولیں ابھی بھوک نہیں بجھی' تو دوسری نے اپنا بچہ دے دیا اور اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ غرض چالیس کے چالیس بچوں کی تکہ بوٹی کر دی' پھر بولیں اب کیا کھائیں؟ ایک نے ابا جان کی طرف اشارہ کر کے کہا' یہ انسان جو بیٹھا ہے اس کو کھا لیتے ہیں۔ سو چالیس کی چالیس اپنے خون آلود ہاتھ منہ کے ساتھ ابا جان کی طرف جو بڑھیں تو ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی اور وہ بے

وش ہو کر گر پڑے۔

جب صبح وہ گھر نہ پہنچے تو تلاش شروع ہوئی۔ پھوپھی یہ سمجھتی تھیں کہ رات کو ستاد کے یہاں ہوتے ہیں۔ سو ڈولی منگوا کر خود ان کے یہاں بھتیجے کی تلاش میں گئیں۔ انہوں نے سنا تو متفکر ہوگئے۔ فوراً امام صاحب کی درگاہ پہنچے۔ وہاں شاگرد بے ہوش پڑا تھا' لیکن خوش قسمتی سے حصار کے اندر تھا اور سانس چل رہی تھی۔ فوراً اٹھوا کر گھر لائے۔ عملیات سے علاج شروع کیا اور آخر ابا جان ہوش میں آ گئے۔ مرشد سے رات کا ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا یہ وہی چالیس جنات تھے' تمہیں خوفزدہ کرنا چاہتے تھے' لیکن وہ حصار میں داخل نہیں ہوسکتے تھے' اگر تمہارے ہوش بحال رہتے تو وہ آج سے تمہارے معمول بن جاتے۔ اماں جان فرمایا کرتی تھیں کہ یہ ابا جان کے مرشد کا تصرف تھا جو وہ زندہ بھی رہے اور ان کے ہوش و حواس بھی قائم رہے' ورنہ ایسے عملیات جب بگڑ جاتے ہیں تو عامل مجنون ہو جاتے ہیں۔

میں نے ابا جان سے براہ راست سوال کیا تھا کہ وہ خود ہمیں یہ واقعات سنائیں' لیکن انہوں نے بات یہ کہہ کر ٹال دی کہ میاں ان واقعات کو اتنا زمانہ گزر گیا کہ ممکن ہے میں کوئی تفصیل غلط بیان کر دوں' لہٰذا ان کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اصرار کرنے کی مجھ میں جرات نہ ہوئی' لیکن نفس واقعہ سے انہوں نے بھی انکار نہ کیا۔

کہتے ہیں جوانی میں ابا جان مردانہ وجاہت کی تصویر تھے۔ ضعیفی میں بھی بڑے شاندار تھے' چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' دوہرا بدن' گورا رنگ' نہایت ستواں نقش' روشن آنکھیں' ہزار دو ہزار میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے تھے۔ اپنی وجاہت ذاتی اور علمی سے ہر محفل پر چھا جاتے تھے۔ لباس اور خوراک میں نہایت نفیس اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ پھلوں میں خربوزہ' آم' انگور' بی دانہ' امرود اور ناگپوری سنگترہ پسند کرتے تھے۔ خربوزہ اور آم کے سلسلہ میں بالخصوص مرزا غالب کی طرح "میٹھے اور بہت" کے قائل تھے' لیکن عموماً بسیار خوری کو ناپسند کرتے تھے' کھانا نفیس کھاتے تھے' مگر کم کھاتے تھے۔ خود ہر قسم کا کپڑا سینا اور ہر قسم کا کھانا پکانا جانتے تھے' لہٰذا لباس اور

کھانے میں معمولی سے نقص کو پکڑ لیتے تھے۔ میاں بیوی میں محبت نہیں عشق تھا' جو چھپن سال کی شادی شدہ زندگی میں اور بارہ بچے پیدا ہونے کے باوجود آخر تک اسی طرح قائم رہا۔ سنا ہے جوانی میں بیوی کو اپنے ہاتھ سے کپڑے سی سی کر پہناتے تھے۔ اماں جان کو ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا پہنایا۔ ان کے لیے کپڑا اور جوتیاں دلی سے خاص طور پر آیا کرتی تھیں۔

عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ادب پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی کے تراجم بکثرت پڑھتے تھے' چونکہ غیر معمولی حافظہ پایا تھا' لہٰذا بے شمار حکایات' امثال' واقعات اور روایات یاد تھیں۔ اشعار باموقع اور برجستہ پڑھتے تھے۔ زبان بڑی رواں اور شیریں اور بیان بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ شہر بھر میں دعوتوں میں ان کی شرکت پر بڑا اصرار کیا جاتا تھا۔ جس دعوت میں وہ شریک ہو جاتے تھے وہاں کی رونق ہی اور ہوتی تھی۔ ان کی عادت تھی کہ رات کو دیر سے نکلا کرتے تھے۔ میں چونکہ سب سے چھوٹا ہونے کے سبب غیر معمولی طور پر لاڈلا تھا' اس لیے اکثر مجھے ساتھ رکھتے تھے۔ اہل ذوق صاحب محفل سے پوچھ لیتے تھے کہ کیا بڑے قاری صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں اور اگر جواب اثبات میں ملتا تھا تو پھر ان کا انتظار کرتے تھے۔ دعوتوں کا دستور فرش پر کھلانے کا تھا۔ دری' چاندنی یا جاجم کے فرش پر دستر خوان لگتے تھے۔ جب ابا جان تشریف لاتے تھے تو مخصوص احباب کی محفل بیٹھتی تھی' پھر کھانے کے ساتھ وہ حکایات' وہ چٹکلے وہ خاندانی واقعات بیان کرتے جاتے تھے کہ نصف شب گزر جاتی تھی اور کھانا تو کیا کھایا جاتا تھا لوگ ان کے بیان میں کھوئے رہتے تھے۔ نہ سنانے والے تھکتے تھے نہ سننے والے اور نہ صاحب محفل اکتاتے تھے۔ خود میں لڑکپن کے باوجود ان کی باتوں کے لطف میں کھویا رہتا تھا اور نیند پاس نہ پھٹکتی تھی۔

صرف اپنے ہی خاندان کے نہیں سارے شہر کے بزرگ تھے۔ ہر مشکل اور پیچیدہ معاملے میں ان کی رائے لی جاتی تھی اور ان سے فیصلہ کرایا جاتا تھا' جس جوڑے کا نکاح ابا جان پڑھا دیں وہ بڑا خوش نصیب سمجھ جاتا تھا۔ لوگ بڑے اصرار

سے بلا کر لے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ شہر کے ایک بہت مقتدر سرکاری عہدیدار اور عالی نسب رئیس کی بیٹی کی شادی عزیزوں میں طے پائی تھی' سنا ہے دونوں لڑکا لڑکی بھی رشتے سے بہت خوش تھے لیکن لڑکی کے چچا ناراض تھے اور ان کی کوشش تھی کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔ کسی نہ کسی طرح حالات سنبھلے رہے' یہاں تک کہ بارات آگئی۔ اب نکاح کا مرحلہ تھا اور مہر کا سوال اٹھا تو لڑکی کے چچا نے نیت فساد سے مطالبہ کیا کہ مہر ایک لاکھ ہوگا۔ لڑکے کے والد چونک اٹھے' غالباً کشیدگی کی باتیں ہوچکی تھیں' لہٰذا وہ بھی بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا مہر ساڑھے بتیس روپے سے ایک ٹکا زیادہ نہیں ہوگا۔ چچا نے کہا تو آپ تشریف لے جائیں۔ دولہا کے والد نے اپنے بیٹے کو گالی دے کر کہا "اٹھ....." سنا ہے شادی کی تیاری پر دونوں طرف سے روپیہ بے دریغ خرچ کیا گیا تھا' ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ بزرگوں نے بہت کچھ بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن دونوں طرف سے تندی بڑھتی گئی۔ آخر کسی نے کہا بھئی بڑے قاری صاحب کا انتظار تو کر لو۔ بس سب دھیمے پڑ گئے۔ اسی وقت دو بزرگ لپکے ہوئے ابا جان کی طرف آئے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق عشاء کی نماز پڑھ کر آرام کر رہے تھے۔ یہ قصہ سنا تو دستار باندھ کر ساتھ ہو لیے۔ ان کے پہنچتے ہی محفل میں خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے لڑکی کے والد سے پوچھا۔ میاں کیا قصہ ہے۔ انہوں نے کہا حضور مہر کا سوال ہے' ہم ایک لاکھ کا مہر بندھوانا چاہتے ہیں۔ ابا جان نے دولہا کے والد سے پوچھا۔ آپ کیا کہتے ہیں' وہ بولے جناب ساڑھے بتیس روپے مہر ہونا چاہیے۔ ابا جان نے لڑکی کے باپ سے پوچھا' عزیز من یہ بتلاؤ تم زیادہ عزت والے ہو یا تمہارے والد مرحوم زیادہ معزز تھے۔ وہ موصوف بڑے سعادت مند فرزند تھے' فوراً بولے حضور سب عزت میرے ابا جان ہی کی ہے۔ پوچھا تمہاری بیٹی افضل ہے یا تمہاری بہن افضل تھی۔ عرض کیا میری بہن افضل تھی' چونکہ وہ والد صاحب قبلہ کی عزت تھی۔ کہا تو جاؤ' گھر میں سے معلوم کرو تمہاری بہن کا کیا مہر تھا۔ وہ خود جا کر پوچھ کر آئے۔ فرمایا' پھوپھی کے مہر پر بھتیجی کا مہر ہوگا۔ اسے "مہر بالمثل"

کہتے ہیں۔ دولہا کے والد صاحب سے پوچھا' کیوں میاں' آپ کو مہربالمثل منظور ہے۔ انہوں نے عرض کیا' بسروچشم اور یوں یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہوگیا۔ دلہن کے چچا بہت اینٹھے لیکن شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔

شہر بھر میں اسی احترام و محبت سے دیکھے جاتے تھے۔ عموماً دن میں ایک بار صبح کے درس و تدریس کی مصروفیات سے فراغت پا کر بازار جایا کرتے تھے اور پھل اپنی پسند کا خرید کر لاتے تھے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا' جہاں سے گزرتے تھے لوگ خود آگے بڑھ کر سلام کرتے تھے' اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔ دکاندار اپنی دکانوں سے اتر کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میری ننھی سی انا کو اپنے ابا جان کی اہمیت سے بڑی تسکین ملتی تھی! اسی طرح حکام میں بڑا رسوخ و اعزاز تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر صاحب جب پانی پت آتے تھے تو خاص طور پر پیغام بھیج کر بلواتے اور ملتے تھے اور ان کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔ آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم کا اعزاز حاصل تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جب محلّہ انصار میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا' جن ہزاروں مصیبت زدوں نے ہماری خاندانی حویلیوں کے احاطہ میں پناہ لی وہ محفوظ ہوگئے' جب محلّہ کا انخلاء کروایا گیا تو جب تک ابا جان وہاں سے نہیں نکل گئے' شرنارتھیوں کو داخلہ کی اجازت نہیں ملی۔ ابا جان اور ان کے ساتھ میں محلّہ انصار سے نکلنے والے آخری افراد تھے۔ انہوں نے گھر سے چلتے ہوئے صرف دو چیزیں اٹھائیں' ایک بستہ اپنے مسودات کا اور ایک گٹھڑی میں حضرت مرزا مظہر شہیدؒ اور حضرت قاضی محمد ثناء اللہ محدثؒ کے تبرکات تھے حالانکہ ان کے بکس میں زیورات کا صندوقچہ بھی تھا اور غالباً نقد بھی ہوگا' لیکن انہوں نے نظر بھر کر بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان کے بٹوہ میں صرف ایک نوٹ دو روپے کا تھا!

مزاج کے بہت تیز تھے' خصوصاً اولاد کے ساتھ۔ سنا ہے بڑے بہن بھائیوں کا لڑکپن بہت سخت گزرا' خصوصاً بیٹوں کا۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو کھلاتے تو سونے کا نوالہ تھے' لیکن دیکھتے تھے شیر کی نظر سے۔ میں نے سب سے چھوٹا ہونے کے

سبب کوئی سختی نہیں جھیلی' لیکن ان کا رعب اس قدر تھا کہ کسی کو نظر ملا کر بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی' نہ کوئی اونچی آواز سے بول سکتا تھا' لیکن اپنے طلباء کے ساتھ بہت نرم تھے۔

جب پانی پت میں ہوتے تھے تو تدریس صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد شروع ہو جاتی تھی۔ سردی میں چھت پر دھوپ میں نشست ہوتی تھی اور گرمی میں مردانہ میں۔ طلباء دور دور سے آتے تھے' مجھے یاد ہے ایک پٹھان طالب علم علاقہ غیر سے آئے تھے' ان کا نام تو بھول گیا یہ یاد ہے کہ سب شاہ جی کہا کرتے تھے۔ بڑی عمر کے آدمی تھے۔ لب و لہجہ اتنا کرخت اور زبان ایسی سخت ہوچکی تھی کہ قرآن کے حروف اور مخارج کسی طرح ادا نہیں ہوتے تھے۔ ابا جان نے پورا قرآن حرف حرف اور لفظ لفظ خود پڑھایا' جس روز ختم ہوا تو شاہ صاحب بولے "قاری صاحب تم بہت بے ایمان ہے"۔ انہوں نے نرمی سے پوچھا شاہ صاحب "کیوں؟" بولے "جب سے ہم نے تم سے پڑھنا شروع کیا ہے اتنا طالب علم تم سے قرآن سیکھ کر چلا گیا' لیکن ہم آج بھی ویسا ہیں جیسا آیا تھا' ہم کو قرآن پڑھنا نہیں آیا"۔ ابا جان نے نہایت تحمل سے جواب دیا "شاہ صاحب! واقعی میرا ہی قصور ہے' ہم ایسا کرتے ہیں کہ کل ہی دوبارہ شروع کر دیتے ہیں" اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں دوبارہ پڑھانا شروع کر دیا۔

پانی پت سے اجڑ کر پاکستان پہنچے تو ایک ہی دھن تھی کہ کسی طرح یہاں ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے' جہاں سے صحیح معنوں میں علماء نکلیں۔ شروع شروع میں پنجاب کی حکومت نے امید دلائی اور وہ اس امید کے سہارے لاہور میں منتظر بیٹھے رہے' لیکن انہیں جیسے احساس تھا کہ ان کے پاس وقت زیادہ نہیں ہے' لہٰذا جب مرحوم راجہ حسن اختر صاحب کی سعی اور امداد سے اوکاڑہ میں آباد ہوگئے' تو وہاں ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا منصوبہ اللہ کے توکل پر بنا لیا۔ گول چوک کی زمین بڑی جدوجہد کے بعد حکومت سے حاصل کی اور اہل خیر کے تعاون سے مسجد کی تعمیر شروع کی۔ مسجد کے گرد ایک بہت بڑی مارکیٹ ائرہ کی شکل میں تجویز کی گئی۔ دکانوں کے

اوپر فلیٹ بنانے کا منصوبہ بنایا گیا' نظریہ یہ تھا کہ دکانوں کی آمدنی سے دارالعلوم کے اخراجات پورے ہوں گے اور فلیٹس میں اساتذہ اور طلباء قیام کریں گے اور یوں دارالعلوم مالی طور پر خودکفیل ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے دباؤ اور اثر سے آزاد ہوگا۔ ابھی مسجد زیر تعمیر تھی کہ جمعہ ۳ر اپریل ۱۹۵۳ء (۱۸ر رجب ۱۳۷۲ھ) کو مختصری علالت کے بعد انتقال کیا۔ "وَاِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِی جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ" سے قمری تاریخ اور "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" سے شمسی تاریخ نکلتی ہے۔

ان کے شاگرد خدا جانے روئے زمین کے کن کن گوشوں میں تجوید و قرأت کی تعلیم کا نور پھیلا رہے ہیں۔ مجھے جس سلسلہ تلمذ کا ذاتی علم ہے وہ حضرت قاری فتح محمدؒ پانی پتی ثم المدنی سے چلتا ہے۔ ان کے شاگرد کراچی' بہاولپور' ملتان' ساہیوال' چنیوٹ اور پاکستان کے متعدد دوسرے شہروں اور قصبات کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ خود قاری فتح محمد صاحبؒ نے اپریل ۸۷ء میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع کی خاک پاک میں ان کی خاک بھی مل گئی۔

ابا جان کی زندگی کے بے شمار واقعات یاد آ رہے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ سبب تذکیر اور درس بصیرت ہے۔ صرف چند واقعات عرض کرتا ہوں۔ ایک واقعہ تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا ہے' لیکن اس نے اتنی شہرت پائی تھی کہ میں نے بھی اس کی بازگشت سنی ہے اور اس کی تفصیل کسی قدر قاری محمد طاہر رحیمی صاحب نے اپنی تصنیف "سوانح فتحیہ" میں بیان فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے متعدد مقامات پر انسانوں کو تنبیہہ فرمائی ہے کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے' لہٰذا اس سے خبردار رہو اور اس کے ورغلانے میں نہ آؤ۔ سو جس طرح نوع انسانی کا شیطان دشمن ازلی ہے' اسی طرح شیطان صفت انسان بھی ہر نیک نام اور نیک سیرت انسان کے دشمن ہوا کرتے ہیں اور اس کی ایذا رسانی پر تلے رہتے ہیں۔ ابا جان کو زندگی میں جس قدر ناخوشگوار واقعات پیش آئے' ان کے پس پشت کچھ بدنسل اور کم

اصل لوگ سرگرم رہتے تھے' جن کا سرسری سا تذکرہ میں نے اپنے ایک مطبوعہ مضمون "میرا اولین مکتب" میں کیا ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ پانی پت میں ایک مسجد' جسے "گندھیوں والی مسجد" کہتے تھے' ہندوؤں کے علاقہ میں گھری ہوئی تھی اور ہندوؤں نے یہ شرارت شروع کی کہ عین نماز مغرب کی اذان کے وقت اپنے مندروں میں گھنٹیاں اور ناقوس بجانا شروع کر دیئے۔ اس شرانگیزی سے مسلمان اشتعال میں آ گئے اور شہر میں ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ وہ زمانہ انگریزی حکومت کی عملداری کا تھا۔ انگریز ڈی۔ سی' مجسٹریٹ اور کپتان پولیس نے تمام معاملہ کی چھان بین کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ پہلے مسلمان مغرب کی نماز ادا کر لیں اور پھر ہندو اپنے ناقوس اور گھنٹیاں بجائیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لیے کتنا وقت دیا جائے اور طے پایا کہ ایک شام مسلمانوں کی نماز کا وقت نوٹ کیا جائے اور اس کے مطابق حکم لگا دیا جائے۔ اب کسی ایسے عالم کی تلاش ہوئی جس پر تینوں فریقوں کو اعتماد ہو' یعنی مسلمانوں کو بھی' ہندوؤں کو بھی اور اہل حکومت کو بھی اور پورے شہر میں ابا جان کے سوا کوئی دوسرا فرد نہیں تھا' جس کی دیانت اور ثقاہت سب کے نزدیک مسلم ہو' لہٰذا ڈی۔ سی نے ابا جان سے درخواست کی کہ وہ مغرب کی نماز پڑھا دیں' تاکہ یہ قضیہ طے پا جائے' جیسے ہی یہ فیصلہ ہوا ابا جان پر دباؤ پڑنا شروع ہوگیا کہ نماز میں طویل قرأت کریں' تاکہ ہندوؤں کی عبادت زیادہ سے زیادہ تاخیر سے شروع ہو۔ ابا جان نے اس بددیانتی سے انکار کر دیا اور قرآن کریم کے مطابق فرما دیا "**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ**" (سورۃ ۵' آیت نمبر ۸)

(اے اہل ایمان جب اللہ کے لیے گواہی دینے کھڑے ہو تو انصاف کے ساتھ شہادت دو' کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم خلاف عدل کرو۔ عدل پر قائم رہو' یہی تقویٰ ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو' وہ تمہارے اعمال سے

خوب آگاہ ہے)۔

چنانچہ ابا جان نے نماز مغرب پڑھائی اور آپ نے اس میں مسنون قرأت کے مطابق وہ سورتیں تلاوت کیں' جنہیں اصطلاح میں "قصّارِ مفصل" کہتے ہیں' یعنی تیسویں سپارے کے تیسرے پاؤ کی سورتیں جو نہ بہت مختصر ہیں نہ بہت طویل۔ (یہی سورتیں ہیں جن کی تلاوت نماز مغرب میں حرمین شریفین میں کی جاتی ہے) ابا جان کی امامت کے دوران انگریز کپتان پولیس گھڑی لیے بیٹھا رہا اور اس کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا کہ غروب آفتاب کے بعد اتنی دیر تک ہندو اپنی گھنٹیاں اور ناقوس نہیں بجائیں گے۔

لیکن شر پسندوں نے اس موقع سے اپنی سرشت بد کے مطابق فائدہ اٹھا کر ابا جان کے خلاف شورش کھڑی کر دی اور کئی طرح کے اتہامات ان پر لگائے۔ ابا جان نے اپنی فطری بردباری کے مطابق نہ کوئی جواب دیا نہ کوئی قانونی کارروائی کی اور بالاخر ان کا صبر اور ان کا تقویٰ رنگ لایا۔ مخالفین خاسر و خائب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ابا جان کا وہی اعزاز و احترام بحال فرما دیا' جو انہیں ہمیشہ سے حاصل رہا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں روزمرہ کی اشیائے ضرورت ناپید ہو گئی تھیں' جو کچھ ملتا تھا راشن بندی کی قیود کے ساتھ یا بہت گراں قیمت پر ملتا تھا۔ ان دنوں پانی پت میں کپڑے کی فروخت پر سرکاری کنٹرول نافذ کر دیا گیا اور یہ حکم ہوا کہ ہر علاقہ میں دو معززین شہر کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو بیس گز تک کپڑا خریدنے کا پرمٹ جاری کر دیں اور اس پرمٹ پر دکاندار کپڑا فروخت کرے۔ ہمارے محلّہ میں ابا جان کو اور ان کے علاوہ ایک ہندو وکیل کو یہ اختیار ملا۔ ابا جان صبح اپنے درس و تدریس کے معمولات سے فارغ ہو کر خود بازار میں جا بیٹھتے کہ حاجت مندوں کو ان کے گھر آنے کی زحمت بھی نہ ہو۔ یہ انتظام کتنا عرصہ چلا اب یاد نہیں۔ اس کا ذکر ایک واقعہ کی تمہید کے طور پر درمیان میں آگیا ہے' جب ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد ہم سب محلّہ مخدوم زادگان بطور یرغمال گویا مقید تھے تو ایک صاحب ایک روز میرے پاس آئے اور کہنے لگے میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے۔ شہراب اجڑ چکا

ہے' معلوم نہیں زندگی میں پاکستان پہنچنا نصیب ہوتا بھی ہے یا نہیں اور اگر پہنچے بھی تو پھر ملاقات شاید کبھی بھی نہ ہو' اس لیے وہ امانت مجھ سے وصول کریں۔ میں منتظر ہوا کہ دیکھئے کیا دیتے ہیں۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئے' کہنے لگے جس زمانے میں قاری صاحب کپڑے کے پرمٹ جاری کرتے تھے' میں ان کے پاس آیا اور ان سے بیس گز کپڑے کا پرمٹ مانگا' وہ فرمانے لگے' میاں تم تنہا ہو' فی الحال دس گز پکڑا لے لو' پھر کچھ روز بعد اور لے لینا۔ میں دل میں ناراض ہوا کہ بھلا میں ان کی جیب سے تو کپڑا نہیں خرید رہا اور دس گز کا پرمٹ لیے بغیر چلا گیا' میرے دل میں اتنا رنج تھا کہ میں نے قاری صاحب کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ خود کتنا کپڑا گھر لے جاتے ہیں' چنانچہ اپنے دستور کے مطابق جب وہ دوپہر کے وقت بازار سے واپس چلنے لگے تو انہوں نے ایک دکان سے بیس گز کپڑا خریدا' اس کے بعد انہوں نے دوسری دکان سے مزید بیس گز کپڑا لیا اور پھر تیسری دکان سے اور بیس گز لے لیا اور تینوں بنڈل اٹھا کر بمشکل وہاں سے چلے۔ میں بہت خوش تھا کہ عین ان کے گھر کی دہلیز پر انہیں شرمندہ کروں گا کہ آپ تو ساٹھ گز کپڑا بیک وقت لے آئیں اور مجھے بیس گز کا پرمٹ دینا بھی آپ پر شاق ہو۔

ابھی قاری صاحب گھر سے کچھ دور ہی تھے کہ بی سیدانی کے محلّہ کی طرف مڑ گئے اور ایک گھر کے دروازہ پر دستک دی' جس میں ایک بیوہ سیدانی رہتی تھیں۔ اندر سے انہوں نے پوچھا' کون ہے؟ قاری صاحب نے جواب دیا' بہن میں ہوں محی الاسلام۔ آپ کا کپڑا لایا ہوں۔ ان خاتون نے کواڑ کی اوٹ سے ہاتھ بڑھا دیا اور قاری صاحب ایک بنڈل ان کے حوالہ کر کے جلدی سے مڑ گئے۔ وہ بیوہ خاتون انہیں دعائیں دیتی رہیں' جنہیں غالباً قاری صاحب نے تو نہیں سنا' لیکن میں دہلیز میں چھپا ہوا سن رہا تھا۔ اب قاری صاحب اپنے گھر کی طرف بڑھے تو میں بدستور تعاقب میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ چلو ساٹھ گز نہ سہی' چالیس گز بھی تو قانون کی اجازت سے دوگنا ہے' لیکن قاری صاحب اپنے گھر کی گلی میں مڑنے کی بجائے آگے نکل گئے اور اس

گرمی کی دوپہر میں کافی فاصلہ طے کر کے ارائیوں کے محلّہ میں پہنچے اور وہاں ایک بیوہ کے گھر کے دروازہ پر دستک دے کر ایک بنڈل اس کے حوالہ کر دیا۔ اب میرے لیے ان کا پیچھا کرنے کا کوئی جواز تو نہیں تھا لیکن ایک قسم کا تجسّس مجھے کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ قاری صاحب اس علاقہ سے نکل کر ایک اور جانب چل پڑے اور خاکروبوں کے کٹڑہ میں جا پہنچے' وہاں ایک نابینا بیوہ کے دروازہ پر دستک دی اور اس کے پوچھنے پر وہی جواب دیا کہ میں ہوں محی الاسلام' تمہارے لیے کپڑا لایا ہوں' جو تم نے منگوایا تھا اور تیسرا بنڈل اس نابینا بیوہ کے حوالہ کیا۔ وہ تو انہیں دعائیں دیتی رہی اور قاری صاحب خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ میں اپنے دل میں اس قدر شرمسار تھا کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔ دوسری طرف خیال آتا تھا کہ میں خود آگے بڑھ کر قاری صاحب سے معذرت کروں اور معافی مانگوں' لیکن نفس کی شرارت نے اتنا حوصلہ نہ کرنے دیا۔ آج تک یہ واقعہ بطور امانت میرے سینے میں دفن تھا' آج آپ کے سپرد کر کے اپنے ضمیر کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر رہا ہوں۔

میں حیرت سے ان صاحب کے اس بیان کو سن رہا تھا' اس لیے کہ ابا جان کے کردار کے اس پہلو سے میں خود نا آشنا تھا۔ اس روز اس حدیث کا مفہوم میری سمجھ میں آیا کہ خیرات اس طرح کرو کہ تمہارے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے' تمہارے دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔

اوکاڑہ میں آباد ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ تو خاصا فراغت سے گزرا' لیکن جب یکایک سیلاب آ جانے کے سبب وہ بھٹہ بیٹھ گیا' جس کی آمدنی پر بسر اوقات تھی اور اس میں لگایا ہوا تمام سرمایہ ڈوب گیا' تو سخت تنگی پیش آنے لگی۔ اس دوران میں ان کی دیانت' توکل اور سیر چشمی کے دو عجیب واقعات پیش آئے۔ ہماری زرعی زمین کے کلیم تصدیق ہو کر لاہور سے آ گئے تو بھائی جان متعلقہ نائب تحصیلدار سے الاٹمنٹ کے لیے ملے' اس نے کہا آپ کے پانچ مربع تصدیق ہو کر آئے ہیں۔ میرا اختیار دو

مربع الاٹ کرنے کا ہے' آپ مجھے دو ہزار روپیہ فی مربع دیں تو میں زمین آپ کو دے دوں گا۔ بھائی جان نے خلاف عادت اس بات کا ذکر ابا جان سے کر دیا۔ وہ بہت دل گیر ہوئے کہ الٰہی ہم اس پاک وطن میں بھی اپنی زندگی اپنے دین کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے۔ اپنے تمام کاغذات اٹھا کر تحصیلدار کے پاس گئے' اس سے اس ناروا مطالبہ کا شکوہ کیا اور کل کاغذات اس کے سپرد کر کے چلے آئے۔ فرمایا ہم اپنا سب کچھ اللہ کے لیے چھوڑ کر صرف ہجرت کی دولت اور ثواب لے کر اس پاک وطن میں آئے ہیں' اب اگر یہ دولت زمین جائیداد کے لیے لٹانا پڑ رہی ہے تو یہ سودا بہت مہنگا ہے' ہمیں منظور نہیں۔ پھر ہم نے نہ وہ کلیم فارم دیکھے نہ وہ مربعے۔ بھائی جان اس کے بعد اکثر پچھتاتے تھے کہ میں نے ابا جان کو خبر ہی کیوں کی اور بہت دوڑ دھوپ اس سلسلہ میں کرتے رہے' لیکن ابا جان جتنی مدت اس کے بعد زندہ رہے' کبھی اشارۃً بھی انہوں نے اس نقصان کا ذکر نہ کیا' نہ کسی حاکم کے سامنے فریاد کی' بس اپنے خدا پر سب کچھ چھوڑ دیا۔

دوسرا واقعہ غالباً ان کے انتقال سے چند ماہ پہلے کا ہے۔ گھر میں تنگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود ان کے علاج کے لیے دوائیں تک خریدنا محال ہوگیا تھا' لیکن وہ ہر تکلیف سے بے نیاز جامعہ گول چوک کی تعمیر میں منہمک تھے۔ ان دنوں محترم شیخ انوار الحق صاحب ڈی۔ سی منٹگمری تھے' مجھے نہیں معلوم کہ انہیں ابا جان سے کب سے تعارف تھا' لیکن اپنی فطری نیکی اور شرافت کے سبب وہ ابا جان سے بہت محبت اور عقیدت سے پیش آتے تھے۔ ایک روز ایک سرکاری اہلکار نے آکر اطلاع دی کہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اوکاڑہ تشریف لا رہے ہیں اور ابا جان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں [illegible] ابا جان جب جانے لگے تو اماں جان نے بہت زور دے کر کہا کہ دیکھنا موقع ملے تو ان سے اپنی حالت بیان کر دینا۔ وہ یقیناً کوئی انتظام کر دیں گے۔ شیخ صاحب حسب عادت نہایت احترام سے پیش آئے' اپنے ساتھ بٹھایا حالانکہ پورا دربار لگا تھا اور حکام ضلع کے علاوہ معززین شہر بڑی تعداد میں مدعو تھے۔ پوچھا [illegible] خدمت ہو تو فرمائیے۔ بولے'

مسجد کی تعمیر سیمنٹ کی کمیابی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے' اس کا کوئی انتظام ہو جائے تو عنایت ہوگی۔ شیخ صاحب نے فوراً ایک افسر کو حکم دیا کہ ہم نے آج ہی سیمنٹ کا جو سٹاک سربمہر کیا ہے وہ جامعہ گول چوک کو کنٹرول قیمت پر دے دیا جائے' پھر نہایت رازداری سے کہا میرا جی چاہتا ہے' آپ کی کوئی ذاتی خدمت کرنے کی سعادت مجھے ملے۔ آپ کوئی اپنی ضرورت تو بیان فرما دیں۔ ابا جان بہت شکرگزار ہوئے' لیکن جواب یہی دیا کہ خدا کا فضل ہے' کوئی حاجت نہیں ہے۔

اماں جان نے سنا تو بہت ناراض ہوئیں' لیکن ابا جان نے اپنی شان' اپنی وضعداری اور اپنے تقویٰ کے عین مطابق جواب دیا کہ بیگم جس مالک کے ذمہ ہماری حاجت روائی ہے اسے ہماری ضروریات کا ہم سے زیادہ علم ہے' میں بھی اسی سے مانگتا ہوں' آپ بھی اسی کی بارگاہ میں عرض معروض کریں' بندوں کے سامنے کیا ہاتھ پھیلانا۔ اماں جان خاموش ہوگئیں اور پھر جتنے دن وہ زندہ رہے' یہ تذکرہ ان کے سامنے نہیں ہوا۔

مضمون کی وسعت میرے ارادہ اور تجویز سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے اور ابھی بھی بہت کچھ کہنے کو باقی ہے' مگر میں صرف ایک اور مشاہدہ بیان کر کے ان کے ذکر کو آج کی نشست کے لیے ختم کرتا ہوں' اس واقعہ کی کوئی توجیہ عالم اسباب میں تو ممکن نہیں' شاید کوئی عامل روحانیت اور عالم ماورائیت اس پر روشنی ڈال سکے' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ابا جان کا انتقال ۳ر اپریل ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ میں اس سال انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا' سوئم کی فاتحہ کے بعد میں امتحان کے لیے لاہور آگیا۔ جب امتحان سے فارغ ہو کر واپس گیا تو باجی نے بیان کیا کہ جب سے ابا جان کا انتقال ہوا ہے' ہر جمعرات کو عصر اور مغرب کے درمیان ان کے کمرہ کے اس گوشہ سے' جہاں ان کا پلنگ تھا' نہایت تیز اور پاکیزہ خوشبو کی لپٹیں اٹھتی ہیں اور سارے گھر میں پھیل جاتی ہیں۔

میں نے اس بیان کو ان کی خوش عقیدگی' زنانہ وہم پرستی اور دخترانہ محبت پر

محمول کیا اور کچھ دھیان نہ دیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں شام کو بے دھیان صحن میں بیٹھا تھا کہ ایکدم نہایت نفیس خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ خوشبو ابا جان کے کمرہ سے آ رہی تھی جس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ میں چونک اٹھا۔ مجھے خیال ہوا ضرور کسی نے اگربتی جلائی ہے' دوڑ کر کمرہ میں پہنچا۔ وہاں قطعاً" کسی قسم کا کوئی خوشبو کا ذریعہ نہیں تھا' نہ اگربتی' نہ لوبان' نہ عطر' نہ پھول' کمرہ بالکل خالی تھا لیکن جس گوشہ میں ابا جان کا پلنگ ہوتا تھا' وہاں اس قدر تیز' نفیس اور مسحور کن خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں جیسے کسی نے عطر کا کنٹرالٹ دیا ہو۔ وہیں سے وہ خوشبو نکل نکل کر سارے صحن میں پھیل رہی تھی اور یہ کیفیت مغرب کی اذان تک قائم رہی اور پھر خودبخود وہ خوشبو بند ہوگئی۔ میں نے پچھلے پینتیس سال میں یہ واقعہ اکثر اہل علم اور اہل حال کے سامنے بیان کیا۔ اس کی توجیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ کیفیت بہت نادر ہے لیکن معدوم نہیں ہے۔ یہ ان برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنی زندگی قرآن کی خدمت اور اس کے مطالعہ میں' بغیر کسی دنیاوی معاوضہ کے' صرف کرتی ہیں۔ اس کی تصدیق چند برسوں کے بعد اس طرح ہوئی کہ راولپنڈی میں میری پھوپھی زاد بہن کا انتقال ہوگیا۔ نہایت نیک اور پاکباز خاتون تھیں اور تمام عمر قرآن سے خاص محبت کرتی رہیں۔ خود پڑھتی بھی تھیں اور بچیوں کو پڑھاتی بھی تھیں۔ ان کا بھی ایک مخصوص کمرہ تھا اور اس کمرہ میں ایک مخصوص پلنگ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے کمرہ نے بھی اسی طرح چہلم تک ہر جمعرات کی شام کو خوشبو کی لپٹیں اٹھا کرتی تھیں۔

جو مسودات ابا جان پانی پت سے اپنے ساتھ لے کر نکلے تھے' وہ خدا جانے کہاں گئے۔ چار بیٹے جو پاکستان پہنچے' ان میں سے کوئی بھی نہ ان کے علم کا وارث بن سکا' نہ ان کی دینی اور دنیوی وجاہت کا۔ صرف ایک مختصر سا مسودہ جس میں پانی پت کے قرا کا احوال لکھ رہے تھے اور جو ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا مجھے مل سکا ہے۔ اس کا بھی اول و آخر ضائع ہوچکا ہے۔ اب تبرکاً" ان سوانحی خاکوں کو ترتیب و

تسوید کے بعد قارئین اور اہل علم کی نظر کرتا ہوں۔ خود اس مسودہ کے بارے میں لکھتے ہیں "مجھے ۱۳۴۰ھ (۲۲-۱۹۲۱ء) میں سند کی تصحیح اور شیوخ کے سنین وفات معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت سے اس دھن میں لگا ہوں۔ بزرگان پانی پت کے حالات' معتبر حضرات اور مختلف نسب ناموں اور ان کے خاندانی کاغذات سے لیے۔ اس میں بھی چھ سال صرف ہوچکے ہیں مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دیکھئے زندگی میں پورا ہوتا ہے یا نہیں"۔

پانی پت کے قاری

تالیف:- شیخ الشیوخ قاری ابو محمد محی الاسلامؒ

حافظ شمس الاسلام بن شیخ فخرالدین غلام مجدد عثمانیؒ

حافظ صاحبؒ احقر کے دادا مولوی بدر الاسلام کے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۷۸۸ء
۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مختلف اساتذہ سے پڑھا۔ تجوید قاری مصلح الدین عباسیؒ
اور ان کے فرزند قاری لالاؒ سے اخذ کی۔ تمام عمر قرآن کی خدمت میں مصروف
رہے۔ حضرت حکیم سہکوا چشتی قدس سرہ سے فیض باطن اخذ کیا۔ صاحب نسبت و
کرامت بزرگ تھے۔ متعدد فقراء اور شیوخ سے اکتساب علم باطنی کرتے رہے'
خصوصاً حضرت سید سلطان احمدؒ سے خاص تعلق تھا۔ ایک کے سوا خاندان میں سب
بھائی بہنوں سے بڑے تھے۔ باوجودیکہ دونوں چھوٹے بھائی جید عالم اور ذی وجاہت
بزرگ تھے مگر آپ کا ادب و پاس و لحاظ حد سے زیادہ کرتے تھے۔ سامنے بولنا بھی نہ
جانتے تھے۔ ادھر آپ کا یہ حال تھا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کو دونوں چھوٹے
بھائیوں کی رائے پر چھوڑ دیتے تھے اور باوصف بڑا ہونے کے اپنے آپ کو سب سے
خورد تصور کرتے تھے اور ان کا کام کر کے خوش ہوتے تھے۔ یہ تھی بزرگوں کی سیرت!
غدر کی تباہی کے بعد انگریزوں کو خوف و دہشت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور شرفا ان
کی صورت دیکھ کر چھپ جاتے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر
تھے۔ جب وہ رخصت پر پانی پت آئے تو آپ نے ان سے پوچھا بھئی تم فرنگی کو کس
دیکھتے ہو؟ عرض کیا اکثر۔ پھر پوچھا اور اس سے بات چیت بھی کر لیتے ہو؟ عرض کیا
ہمیشہ تو آپ کو شدید تعجب ہوا اور ہم نشینوں سے بار بار فرماتے تھے' میاں بدرالاسلام

کہتے ہیں کہ وہ فرنگیوں سے ملتے اور گفتگو کرتے رہتے ہیں۔

انتقال کا واقعہ عجیب ہے۔ صبح کو چھوٹی بہن بی حبیب النساء نے بلا کر چند کاموں کے لیے عرض کیا۔ آپ نے وہ کام کیے اور دوپہر کے وقت مسجد تشریف لے گئے۔ وضو کے لیے لوٹا بھرا۔ ایک دم گر پڑے اور انتقال ہوگیا۔ سب لوگ حیران ہوگئے اور سکتہ تصور کیا گیا۔ دوا درمن کی فکر میں دوڑ دھوپ ہونے لگی کہ حضرت حافظ غلام مرتضیٰ قدس سرہٗ جو بڑے عالی نسبت مجذوب سالک تھے' تشریف لائے اور آپ کا منہ دیکھ کر کہا "سو گئے سو گئے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ فوت ہوگئے ہیں۔ ۱۸۷۰ء ۱۲۸۷ھ کا یہ واقعہ ہے۔

ایک فرزند حافظ محمد یعقوب اور ایک دختر بی بی مکرم النساء پیچھے چھوڑیں۔

❁

ا ایم۔ اے۔عثمانی عرض کرتا ہے' حضرت غلام مرتضیٰؒ بہت صاحب کرامت مجذوب تھے۔ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے۔ جو بات ان کی زبان سے نکلتی حق تعالیٰ کے حکم سے پوری ہو جاتی۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ آپ کی ہی دعا کی برکت سے پیدا ہوئے اور متعدد تصنیفات میں آپ کا ذکر بہت محبت اور عقیدت سے کرتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت فرماتے تھے کہ مجھ میں جو مجذوبیت اور بے نیازی کا عنصر ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ میں ایک مجذوب کی دعا کی برکت سے پیدا ہوا۔

حافظ محمد یعقوب

حافظ محمد یعقوب پانی پت کے مشاہیر حفاظ میں سے تھے۔ ہر حافظ آپ کو قرآن سنانا فخر و سعادت تصور کرتا تھا۔ تمام دن یہی مشغلہ رہتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے قرآن سنتے رہتے تھے اور ایک دو حافظ ہروقت سایہ کی طرح ساتھ رہتے تھے۔ رمضان المبارک میں یہ محبوب مشغلہ اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ سادگی اور بے نفسی میں کمال حاصل تھا۔ خدائے تعالیٰ نے چار فرزند عطا کیے۔ چھوٹے لڑکے حافظ فخر الاسلام نے ۱۸۹۸ء ۱۳۱۶ھ میں عین شباب میں انتقال کیا۔ مرحوم سے آپ کو غیر معمولی محبت تھی۔ اس واقعہ نے آپ کی صحت پر بے حد ناگوار اثر کیا اور آخرش ۱۸۹۹ء ۱۳۱۷ھ میں انتقال کیا۔ قاضی محمد حسین' حافظ قاری محمد یحییٰ اوز حافظ محمد ابراہیم تین بیٹے چھوڑے۔ حافظ قاری محمد یحییٰ اور حافظ محمد ابراہیم کا ذکر آئندہ آئے گا۔

مولوی حافظ نجم الاسلام بن شیخ فخرالدین غلام مجدد عثمانیؒ

مولانا موصوف احقر کے جد بزرگوار کے منجھلے بھائی تھے۔ ۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد قاری لالاؒ اور قاری قادر بخشؒ سے تجوید اخذ کی اور فارسی وغیرہ معمولی درسیات پڑھنے کے بعد دلی میں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ (پسران حضرت شاہ ولی اللہؒ) اور مولانا مملوک العلیؒ سے درسیات کی تکمیل کی اور شاہ محمد اسحٰقؒ سے حدیث پڑھی اور فضیلت حاصل کر کے وطن لوٹے اور مدت العمر افادہ میں مصروف رہے۔ عجز و انکسار' تواضع تذلل کا نمونہ تھے۔ بیواؤں اور لاوارث عورتوں کے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

محرم ۱۲۷۴ھ یعنی اگست ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ غدر کے دوران انتقال کیا۔ مولوی حافظ انوار الاسلام صاحبزادے اور ایک صاحبزادی باقی چھوڑیں۔ مولوی حافظ انوار الاسلام اپنے پدر بزرگوار کا ثنیٰ اور نہایت پرہیزگار عالم تھے۔ پانچ بیٹے حافظ محمد ادریس' ڈاکٹر حافظ محمد زکریا وغیرہ اور تین بیٹیاں چھوڑ کر ۱۸۹۱ء ۱۳۰۹ھ میں قضا کی۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ ڈاکٹر حافظ محمد زکریا مذکور میرے پھوپھا اور حضرت مولفؒ کے بہنوئی تھے۔ نہایت پارسا' متقی اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ جب برطانوی حکمرانوں نے آگرہ میں میڈیکل سکول کھولا تو اپنی لیاقت کی بنا پر اس میں داخلے کے لیے چنے گئے اور وہاں سے ڈاکٹر بن کر نکلے۔ تمام عمر سرکاری ملازمت میں گزاری۔ غالبا وسطی ہند میں رہے۔ جب ریٹائر ہو کر پانی پت آئے ہیں تو میرا بچپن تھا۔ سانولے رنگ کے' چھوٹے سے قد کے سفید ریش بزرگ تھے۔ اپنا اکثر وقت عبادت اور ذکر الٰہی میں گزارتے تھے۔ شب زندہ دار تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت بکثرت کرتے تھے۔ ابا جان سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ وہ ابا جان کے علم و فضل کی وجہ سے اور ابا جان ان کی بزرگی اور درویشی کے سبب۔ دونوں میں محبت بھی بہت تھی۔ پھوپھا صاحب اکثر دعا

کرتے تھے کہ الٰہی میری عمر میاں محی الاسلام کو لگ جائے تاکہ وہ اسی طرح خدمت قرآن کرتے رہیں۔

دونوں سالے بہنوئی میں ایک دلچسپ بحث رہا کرتی تھی۔ پھوپھا جان اپنی درویشانہ طبیعت کی وجہ سے نہایت درجہ توکل پسند اور کھانے پینے کے سلسلہ میں بالخصوص سادہ مزاج تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی موجودگی میں کھانے میں نقص نکالے۔ فرماتے تھے یہ شکر کے خلاف ہے۔ اللہ کی نعمتوں میں خرابی نکالنا کفران نعمت ہے۔ ایک بار ان کے بڑے صاحبزادے قاضی معظم الاسلام عثمانی نے' جو شادی شدہ' صاحب اولاد اور برسرکار تھے' ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں اپنی بیوی سے نہایت نرمی سے صرف اتنا کہہ دیا کہ کھانے میں نمک تیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں اتنی سخت سزا دی کہ پھر زندگی بھر انہوں نے کھانے کے بارے کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ مجھے اس واقعے کا علم نہ تھا۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ بھائی صاحب' آپ کھانے کے دوران کبھی ایک لفظ بھی کھانے کے بارے میں نہیں کہتے۔ انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہنے لگے کہ میاں وہ دن اور آج کا دن' احساس ہی مٹ گیا کہ ذائقہ کیا ہے اور بد ذائقہ کیا ہے۔ جو سامنے آ جاتا ہے کھا کر شکر کر لیتا ہوں۔

ابا جان کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ کھانے میں نہایت خوش ذوق اور نفیس مزاج تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ ہرگز شکر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں تو یہ کفران نعمت ہے۔ شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رنگینی اور بوقلمونی اس کائنات کو بخشی ہے' جو قسم قسم اور نوع نوع کی نعمتیں اس نے پیدا کی ہیں' ان سب کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اور ان سے الگ الگ لطف اندوز ہونے کا پورا سلیقہ ہو۔ پھوپھا سے کہتے بھائی صاحب دیکھئے کتنی قسم کی دالیں اور کتنی قسم کے مصالحے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے۔ مرچ ہی دیکھئے' سرخ' سیاہ' سبز' چھوٹی' لمبی' پہاڑی وغیرہ وغیرہ۔ ہر ایک کا ذائقہ الگ۔ ہر ایک کی رنگت الگ۔ سبزیوں میں نیرنگی ملاحظہ کیجئے۔ ایک خاندان میں لوکی الگ' ٹنڈا الگ' توری الگ' پیٹھا الگ۔ شکر یہ ہے کہ ہم ان سب کو ان کے جملہ خواص

کے ادراک کے ساتھ استعمال کریں' نہ کہ شکر یہ ہے کہ کھانے والے کو احساس ہی نہ ہو کہ وہ اپنے خالق کی کس نعمت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ غرض دونوں میں یہ دلچسپ نوک جھونک جاری رہتی تھی لیکن دونوں ہی اپنی اپنی روش پر قائم رہے۔ ایک کا مسلک اس کی درویشی کے مطابق تھا اور دوسرے کا اس کی علمیت کے۔

ان تمام بزرگوں کی ایک خوبی یا خصوصیت جو مجھے آج خاص طور پر یاد آتی ہے' وہ ان کا رزق حلال پر اصرار اور اس کے بارے میں ازحد احتیاط تھی۔ مجال ہے کوئی مشتبہ چیز ان کے استعمال میں آ جائے۔ پھوپھا صاحب کی یہ احتیاط فقر و غنا تک بڑھی ہوئی تھی۔ ان کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت تھی لیکن امیر غریب کبھی کسی سے فیس طلب نہ کی۔ اگر کسی نے دے دی تو لے لی ورنہ توکل۔ ایک مشن کے باقاعدہ معالج مقرر ہوگئے۔ ہر وزٹ (Visit) کی فیس لینے کا حق تھا۔ کئی بار گئے۔ نہ انہوں نے پیش کی نہ انہوں نے مانگی۔ اور بے عذر ہر بار بلانے پر حاضر۔ ایک روز ان کے علم کے بغیر بیٹے نے بل بنا کر بھیج دیا۔ وہاں سے فی الفور ادائیگی ہوگئی۔ پھوپھا صاحب کے ہاتھ میں رقم آئی تو حیران ہوئے۔ کھٹک گئے۔ بولے میں نے تو نہیں منگائی' پھر کس نے یہ فیس منگائی ہے۔ پھوپھی صاحبہ ان کی تیز مزاجی سے واقف تھیں۔ بیٹے کو بچانے کی خاطر اپنے سر الزام لیا کہ میں نے کہلوایا تھا۔ پھوپھا جان سمجھ گئے اور کئی روز نہ بیوی سے کلام کیا نہ بیٹے سے۔ شاید گھر میں کھانا بھی نہیں کھایا کہ یہ رزق مجھ پر حلال نہیں۔ میں معالج ہوں' ہندو بنیا یا لوہار ترکھان نہیں کہ مزدوری مانگ کر لوں اور مہاجن کی طرح قرض وصول کروں۔

میں جب حافظ ہوا تو بہت روانی سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔ بلکہ مجھے اپنی روانی پر ناز تھا۔ بلند آواز سے ایک گھنٹہ میں چار سپارے اور خاموشی سے ایک گھنٹہ میں چھ سپارے پڑھ لیا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی درگاہ پر ختم قرآن کی محفل تھی۔ میں نے بھی سپارہ لیا اور پھوپھا صاحب کے پاس بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ لیکن میرے سپارہ ختم کرنے سے پہلے وہ ایک سپارہ ختم کر کے دوسرا لے

آئے۔ میں بہت حیران ہوا۔ دوسرا سپارہ پڑھنے میں میں نے پہلے سے بھی زیادہ عجلت دکھائی لیکن پھوپھا صاحب پھر مجھ سے پہلے ہی فارغ ہوگئے۔ غرض جتنی دیر میں سپارے پڑھتا رہا وہ بھی پڑھتے رہے اور مجھ سے آگے ہی رہے۔ سچ ہے ان کا عمر بھر کا ریاض تھا اور میرا محض لڑکپن کا لاابالی پن۔

مسجد سے عشق رکھتے تھے اور اپنا اکثر فارغ وقت مسجد ہی میں گزارتے تھے۔ گھر کے نزدیک ایک پرانی مسجد ویران پڑی تھی۔ در و دیوار شکستہ ہوچکے تھے۔ اس کو آباد کرنے کی ٹھانی۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے قاضی منہاج الاسلام عثمانی نے اس کی مرمت اور حیات نو کا بیڑہ اٹھایا۔ مسجد کی کرسی کافی اونچی تھی۔ صحن گلی سے چھ سات فٹ بلند تھا۔ گلی کی سمت ایک چبوترہ تھا جس پر بیٹھ کر پھوپھا اوراد و وظائف پڑھتے تھے۔ ابھی چبوترہ پر حفاظتی کٹہرا نہیں لگا تھا۔ ایک روز اچانک اس چبوترے سے بیٹھے بیٹھے سر کے بل گلی میں گر پڑے' شاید اونگھ آگئی ہوگی۔ بہرحال سر میں کافی گہرا زخم آیا۔ خون بہت ضائع ہوگیا۔ ایک طرف ضعیف العمری' دوسری طرف اپنی درویشانہ روش کے سبب جسمانی نقاہت۔ اسی زخم سے انتقال کیا اور شہادت صغریٰ کا مرتبہ پایا۔ یہ غالباً ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ اس وقت میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

مولوی حافظ بدر السلام بن شیخ فخر الدین غلام مجدد عثمانیؒ

خاکسار مولف کے جد بزرگوار ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن حفظ کر کے قاری مصلح الدینؒ قاری لالاؒ اور قاری قادر بخشؒ سے تجوید اخذ کی۔ ابتدائی درسیات حاصل کرنے کے بعد دلی جا کر مولانا مملوک العلیؒ اور شاہ محمد اسحٰقؒ سے علوم کی تکمیل کی اور مولانا کرم اللہ سے سبعہ قرأت سبعاً" اخذ کیں۔

وطن واپس آ کر اپنے چچا مولوی قاضی صفوۃ اللہ خان بہادر صدر الصدور کے پیش میں ملازمت کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد انگریزی ملازمت میں بعہدہ نائب تحصیلداری مقرر ہوگئے۔ شرفائے پانی پت میں سے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سرکار انگریزی سے تعلق پیدا کیا۔ اپنے تدین اور محنت کی وجہ سے بہت جلد تحصیلدار اور اسسٹنٹ کلکٹر اور نائب مہتمم بندوبست بن گئے۔

علماء و صلحاء سے ہم نشینی رہتی تھی۔ اتوار کو کچہری کرتے تھے اور جمعہ کی چھٹی۔ مسند و تکیہ پر اجلاس کرتے تھے۔ حکام اور پبلک دونوں میں معتبر تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء مطابق رمضان ۱۲۷۲ھ جس وقت غدر کی مصیبت آئی' آپ انبالہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ کسی ناعاقبت اندیش ملا نے وہاں بھی جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ حکام وقت کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے باہمی مشورہ سے فوجی پہرہ قائم کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ مگر صاحب ڈپٹی کمشنر کے اصرار سے آپ کو مشورہ کے لیے بلایا گیا۔ آپ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور کہا کہ اس حالت میں ضرور فساد ہو جائے گا کیونکہ فوج اور پبلک دونوں جاہل ہیں اور ذرا سے اشتعال سے کام بگڑ جائے گا۔ پھر آپ نے کہا حکام کو وقار اور متانت سے کام لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کوئی فساد نہ ہوگا۔ اور جب ایک نووارد انگریز نے کہا کہ اگر فساد ہوا تو ان انگریزوں کے بال بچے جو سٹیشن میں مقیم ہیں ہلاک ہو جائیں گے تو آپ نے تحریری ضمانت داخل کر دی اور مقامی حکام نے آپ کی رائے پر کاربند رہنے کا فیصلہ کر دیا۔

ادھر وہ پرجوش مجمع جس کو جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا' آپ کی مسجد میں جمع ہوگیا اور جب ظہر کی نماز کے بعد آپ نے اجتماع کی وجہ پوچھی تو بعض منچلے آدمیوں نے واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا "انگریزوں کے خلاف شرعاً" جہاد نہیں ہوسکتا اور نہ انبالہ میں یہ طاقت ہے کہ سلطنت کا مقابلہ کر سکے"۔ پھر فرمایا "یاد رکھو میں نے اہل انبالہ کی ضمانت داخل کر کے انگریزوں کو فوج اور توپ خانہ متعین کرنے سے روکا ہے۔ اگر تم کوئی بے اعتدالی کرو گے تو تمام الزام مجھ پر عاید ہوگا"۔ ان کی فراست و دیانت پر عوام کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ پرجوش مجمع منتشر ہوگیا اور انبالہ میں کوئی شخص فساد نہ کرا سکا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور بعض دیگر علماء کی گرفتاری کا حکم جاری ہوچکا تھا۔ آپ نے ان تمام حضرات کو دریائے ستلج کے ذریعہ سے کرانچی اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچا دیا۔ بعض بدخواہوں نے آگرہ بورڈ تک اس کی شکایت پہنچائی تو آپ سے جواب طلب کیا گیا۔ صاحب کمشنر بہادر سے آپ نے کہا "بیشک میں نے ایسا کیا ہے اور اس کی وجہ اپنے مذہب کی بھی اور گورنمنٹ اور ملک کی بھی خیرخواہی تھی۔ وہ لوگ بااثر علماء دین ہیں' اگر ان کو گورنمنٹ گرفتار کرتی تو ملک میں دوبارہ فساد ہو جاتا' جس سے حکومت اور ملک دونوں مشکلات میں پھنس جاتے"۔ آپ کا یہ جواب بڑی اہمیت سے دیکھا گیا اور صاحب کمشنر کی سفارش پر حکام نے اس کا بھی شکریہ ادا کیا اور آپ کی نیت اور فعل کو مستحسن قرار دیا گیا۔

اپنی اولاد' خاندان اور قوم کے ان نوجوانوں کی تعلیم کے لیے جو بسبیل روزگار وغیرہ آپ کے پاس رہتے تھے' کسی اعلیٰ پایہ کے عالم کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور سب سے نماز کی پابندی کرائی جاتی تھی۔ تساہل اور تغافل کرنے والوں پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اس سے ملازم بھی مستثنیٰ نہ تھے اور ان کا حساب باقاعدہ ایک منشی کے سپرد تھا۔ نادار مسافروں اور معذوروں کی اس فنڈ سے مدد کی جاتی تھی۔

یکم جنوری ۱۸۵۷ء سے سو روپے ماہوار حج کے نام سے جمع کرتے تھے اور اس کا

حساب کتاب بھی الگ تھا۔ بعض آدمیوں کو مضاربت پر اس میں سے کچھ روپیہ دے کر تجارت بھی کرائی اور پہلے پہلے جو منافع ہوا اس کو بھی اس رقم میں شامل کر لیا۔ اس پر سالانہ زکوٰۃ نکالتے رہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے راس المال کا معتد بہ حصہ خسارہ میں تلف ہوگیا۔ بایں الفاظ ایک سادہ کتاب میں' جس کو بعد میں روزنامچہ حج بنایا' فارسی میں اس کی بابت یہ وصیت تحریر کی "یہ بھی رقم امانت حج بیت اللہ شریف کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نصیب فرمائے۔ میں اپنے گھر والوں کو اس امر کی وصیت کرتا ہوں کہ اگر میں اپنا مدعا پورا ہونے سے قبل مرجاؤں تو میرے ان ہی پسماندگان پر' جو میرے ترکہ کے وارث بنیں' لازم ہوگا کہ اس رقم جمع کردہ میں سے کسی شریف اور نیک آدمی سے' جو اپنا فریضہ حج پہلے ادا کر چکا ہو' اتنا خرچ وغیرہ دے کر جس کو وہ صاحب قبول فرمائیں میری جانب سے حج بدل کرائیں کیونکہ میرے ذمہ حج فرض ہے تاکہ میرے ذمہ سے حج ساقط ہو جائے اور پروردگار عالم جل شانہ اس حج کے صدقہ سے میری نجات فرمائے۔ بلکہ ممکن ہوسکے تو مولانا حاجی نواب قطب الدین خان یا مولوی مظفر حسین کاندھیلوی جیسے متبرک اشخاص کے ذریعہ سے یہ فرض انجام دلائیں اور بے علم اشخاص کا اعتبار نہ کریں ورنہ قیامت کے دن میں ان لوگوں کا دامن پکڑوں گا جو میرے ترکہ کے وارث بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ عز اسمہ میری زندگی میں مجھے نصیب کرے اور اگر میں مرجاؤں تو میرے وارثوں کو توفیق رفیق عطا فرمائے کہ میری اس وصیت پر کاربند ہوں۔ آمین۔ آمین۔ آمین یا رب العالمین"۔

اہل پانی پت میں سے مولوی اکرام اللہ (حضرت مؤلف کے نانا) نواب امان اللہ خان (حضرت مؤلف کی اہلیہ کے دادا) اور حکیم نتھو وغیرہ کو آپ نے آمادہ کر کے ساتھ لیا اور ۵ر جمادی الاول ۱۲۷۶ھ روز پنج شنبہ مطابق یکم دسمبر ۱۸۵۹ء کو ایک سال کی رخصت لے کر ایک سو دس افراد کا قافلہ بنا کر جس میں ۷۲ مرد' ۳۴ عورتیں اور چار بچے تھے' (ان میں ۱۰ مرد' ۹ عورتیں' ۲ بچے' جمع اکیس افراد آپ سے متعلق تھے) پانی پت سے روانہ ہوئے اور ۱۷ر جمادی الاول ۱۲۷۶ھ کو پھلور پہنچ کر لدھیانہ سے براہ ستلج

۵ کشتیوں میں روانہ ہوئے اور ۲۰ر جمادی الثانی ۷۶ھ کو سکھر سے چلے اور ۲۰ر رجب کو کراچی سے عدن اور پھر وہاں سے چل کر ۱۸ر رمضان مطابق ۱۰ر اپریل ۶۰ء کو مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یکم شوال مطابق ۲۱ر اپریل کو بہ سواری اونٹ مدینہ منورہ گئے اور آخر ذیقعد یعنی ۱۸ر جون ۶۰ء کو واپس مکہ معظمہ پہنچے اور آخر ذی الحج تک وہیں رہے۔ ابتدائے محرم ۷۷ھ تقریباً ساڑھے تین ماہ حرمین میں گزار کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ واپسی پر براستہ بمبئی آئے اور یکم صفر کو وہاں سے چل کر احمد آباد' اندور' گوالیار سے ہوتے ہوئے ۷ر ربیع الثانی ۷۷ھ کو گیارہ ماہ دو یوم کے بعد پانی پت پہنچ گئے۔

آپ مکہ معظمہ سے واپس آنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ارادہ تھا وہیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرؒ کے ساتھ رہیں اور بقیہ زندگی حرم میں گزاریں۔ لیکن اہل و عیال نے جدائی گوارہ نہ کی اور منت سماجت کر کے ہندوستان لے آئے۔ مکہ معظمہ سے روانہ ہوتے ہوئے آپ نے دعا کی "یا اللہ' میں تیرے گھر سے اپنی خوشی سے نہیں جاتا بلکہ یہ لوگ مجبور کر کے اس لیے لے جا رہے ہیں کہ ان دنیوی فوائد سے محروم نہ ہو جائیں جو ان کو پہنچتے ہیں۔ تو دلوں کا بھید جانتا ہے' پس تو مجھے حصول دنیا کا ذریعہ نہ بنا"۔ نہایت مغموم و پریشان واپس آئے اور بقیہ ایام رخصت پانی پت میں گزار کر انبالہ جا کر کام کا چارج لے لیا۔ لیکن طبیعت کو دنیا سے نفرت اور اُدھر کی ایسی رغبت پیدا ہوگئی تھی کہ بہت جلد بیمار ہوگئے۔ ۱۸۶۱ء ر ۱۲۷۸ھ کو بمقام انبالہ شہر انتقال کیا اور وہیں شاہ عبدالرسول کی مسجد میں دفن ہوئے۔ صحن مسجد سے ملی ہوئی شرق و شمال میں قبر پختہ بنی ہوئی ۱۹۴۷ء تک موجود تھی۔

حافظ ضیاء الاسلام' حافظ مصباح الاسلام' قاضی مفتاح الاسلام تین بیٹے' مسماۃ بشیر النساء' مسماۃ معظمۃ النساء دو بیٹیاں باقی چھوڑیں۔ تینوں بیٹوں نے متوسط درجہ تک علوم کی تحصیل کی۔ دونوں بڑے لڑکے حافظ تھے۔ حافظ مصباح الاسلام نے' جو پرہیزگاری اور صلاحیت میں باپ کا ثنیٰ تھے' والد کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں ۱۸۶۶ء ر ۱۲۸۳ھ میں ایک فرزند قاضی ذکاء الاسلام باقی چھوڑ کر والدہ ماجدہ اور بھائیوں کو داغ

مفارقت دیا۔

حافظ ضیاء الاسلام ریاست کپور تھلہ میں تحصیلدار تھے۔ صلہ رحمی' عزیزوں سے حسن سلوک' فیاضی' سخاوت' مہمان نوازی' غریب پروری' معاملہ فہمی' خودداری وغیرہ اوصاف میں تمام کنبہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ رؤسائے کپور تھلہ سے یگانگت اور میل جول اتنا بڑھا لیا تھا کہ وہیں کے باشندے شمار ہوتے تھے۔ ۱۸۸۴ء/ ۱۳۰۱ھ میں بعمر ۵۶ سال قاضی رضی الاسلام (نامی) ایک فرزند چھوڑ کر قضا کی۔ افسوس وہ بھی ۱۹۰۶ء/ ۱۳۲۴ھ میں بعمر ۵۹ سال وہیں وفات پا گئے۔

مؤلف بیان فرماتے ہیں کہ میرے والد قاضی مفتاح الاسلام دنیا سے متنفر اور بیگانہ رہتے تھے۔ بڑے بھائی کی حیات تک ریاست بھوپال میں ملازم رہے' پھر اس کو بھی ترک کر دیا۔ پہلا حج والد کے ساتھ کیا تھا' چار حج بعد میں کیے اور آخری دفعہ کے سوا ہر مرتبہ چھ چھ مہینے یا اس سے زیادہ مجاور حرمین رہے۔ اس کے علاوہ نجف اشرف' کربلائے معلیٰ' کاظمین' سامرہ اور بغداد میں زاید از دو سال معتکف رہے۔ ہندوستان کے مزارات میں سب جگہ چلّے کیے' خصوصاً خواجگان اجمیر' دہلی' پاک پتن' کلیر شریف کے مزارات پر بار بار حاضر ہوتے تھے اور زیادہ سے زیادہ عرصہ قیام کرتے تھے۔ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ رات کا آخر حصہ اشغال و اوراد میں گزارتے تھے اور بیماری وغیرہ میں اگر کوئی منع کرتا تھا تو ناراض ہوتے۔ چھٹے حج کے واسطے آمادہ تھے بلکہ اپنا اسباب اور کتابیں روانہ کر چکے تھے کہ رمضان المبارک میں بخار چڑھا۔ کسی کو اس پر مطلع نہ کیا اور نہ مسجد میں معتکف ہونے کی وجہ سے گھر والوں کو معلوم ہو سکا۔ عید کے روز معلوم ہوا تو فرمایا کہ اب مجھے افاقہ ہے اور روزہ سے طبیعت درست ہو جاتی ہے' چنانچہ بعد میں بھی روزے رکھتے رہے جس سے ضعف زیادہ ہو گیا اور اسی ضعف کی وجہ سے ۲۵ر صفر ۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء شب جمعہ کو پانی پت میں بعمر ۶۹ سال انتقال کیا اور شاہ محمد فاضل چشتیؒ کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ یہ ناکارہ اور تین بہنیں باقی چھوڑیں۔

میری بڑی پھوپھی بشیر النساء بیگم سب بھائی بہنوں سے بڑی اور قرآن کی خاص خادمہ تھیں۔ بی افضل النساء سے قرآن پڑھا تھا۔ ۱۸۶۸ء ر ۱۲۸۵ھ میں بیوہ ہو جانے کے بعد حفظ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک پندرہ سپارہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد پڑھتی تھیں' پھر دس کا معمول کر لیا' پھر ایک منزل اور جب زیادہ ضعیف ہو گئیں تو تین سپارے پڑھتی تھیں--- بہت سے لڑکے لڑکیوں کو حفظ قرآن پڑھایا۔ میرا سبق یاد کرانا' پچھلا سننا عرصہ تک اپنے ذمہ رکھا۔ ذرا غصہ زیادہ تھا۔ اس کے سوا عبادت' ریاضت اور سخاوت میں ایک نشان تھیں۔ ۱۹۱۴ء ر ۱۳۳۲ھ میں بعمر ۹۰ سال انتقال کیا۔ ایک بیٹی مسماۃ فاطمہ بیگم چھوڑیں جو میری (مؤلفؒ) کی خوش دامن تھیں۔ اور تمام نیکیوں میں اپنی ماں کی نظیر' اور بے نفسی' ایثار اور انکسار میں بے مثل تھیں۔ انہوں نے کسی قدر سبعہ قرأت بھی پڑھی تھی اور میرے سبعہ قرأت پڑھنے کا باعث ہوئیں۔ افسوس اپنی ماں سے ایک سال بعد بعمر ۵۷ سال فوت ہو گئیں۔

❁

مولوی حافظ اکرام اللہ بن خواجہ شکر اللہ انصاریؒ

مولانا موصوف احقر کے نانا تھے۔ صحیح سال پیدائش کا تعین نہ ہوسکا۔ ان کی پیدائش سے پہلے کئی بھائی بہن فوت ہوچکے تھے لہٰذا خاص طور پر پرورش کی گئی۔ آپ کے دادا مولوی برکت اللہ بڑے زبردست عالم اور شیخ وقت تھے۔ ان کی نگرانی میں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد قاری مصلح الدینؒ اور ان کے فرزند قاری لالاؒ سے تجوید اخذ کی اور اس میں فضیلت کے درجہ تک پہنچے۔ بہت سے طلبا نے آپ سے تجوید پڑھی۔ ابتدائی درسیات فقہ اور دیگر علوم اپنے دادا بزرگوار سے پڑھیں۔ معقولات کی تکمیل مولانا مملوک علیؒ سے کی اور حدیث حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ سے پڑھی جو اپنے وقت کے امام اور مجدد تھے۔ دستار بندی کے بعد دادا صاحب نے طلباء کا پڑھانا آپ کے سپرد کر دیا' چنانچہ تمام عمر درس دیتے رہے۔

آپ کے والد خواجہ شکر اللہ اودھ میں چکلے دار تھے۔ رشتہ کے چچا خواجہ غلام حسین نائب چکلہ دار تھے۔ حقیقی چچا اور خسر خواجہ علی اللہ بھی وہیں کسی منصب پر فائز تھے۔ تینوں بھائیوں نے وہاں کی صحبت سے شیعہ مسلک اختیار کر لیا تھا اور ان کی وجہ سے پانی پت کے انصاریوں کے قبیلہ سے کافی لوگ وہاں چلے گئے تھے اور معدودے چند کے سوا سب پر وہی رنگ چڑھ گیا تھا۔ خواجہ صاحب لکھنؤ گئے تو آپ بہت کمسن تھے۔ اس کے بعد والد اور چچا نے آپ کو بارہا وہاں بلایا تھا لیکن تعلیم کے نقصان کی وجہ سے دادا نے نہ بھیجا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد گئے۔ باپ کو بیٹے اور بیٹے کو

باپ کے دیکھنے کا حد سے زیادہ اشتیاق تھا۔ برسوں کی جدائی کے بعد مل رہے تھے۔ آپ کو بھی شیعیت کی دعوت دی گئی مگر آپ نے بقول غالب مرحوم ۔

بامن میاویز اے پدر' فرزند آزر را نگر
ہرکس کہ شد صاحب نظر او دین آبا خوش نکرد

(اے پدر' مجھ سے ناراض نہ ہو' آزر کے بیٹے (ابراہیمؑ) کی طرف دیکھ' جس کو خدا بصیرت عطا کر دے اس کی تسکین محض تقلید آبا سے نہیں ہوسکتی) رد کر دیا۔

خواجہ شکر اللہ صاحب نے آپ کے زندہ رہنے اور جوان ہونے کے لیے کچھ نذریں مان رکھی تھیں۔ آپ نے ان میں بھی شریک ہونے سے انکار کر دیا اور جب آپ سے کہا گیا کہ رنگین اور ریشمی کپڑے پہنیں تو آپ نے اس کو بھی نہ مانا۔ خواجہ صاحب ناراض ہوگئے۔ چچا نے آپ کو بہت سمجھایا' منت سماجت کی۔ **اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ** کی تبلیغ کی (سورۃ نحل کی آیت نمبر ۱۰۶ کی طرف تلمیح ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے ایمان کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے پر مجبور کر دیا جائے مگر اس کا دل ایمان پر قائم رہے تو اس پر اس مجبوری کی حالت میں کوئی گناہ نہیں) مگر آپ **لَا طَاعَتَہٗ لِلْمَخْلُوْقِ فِیْ مَعْصِیَتِہِ الْخَالِقُ** (جس امر میں خدا کی نافرمانی کرنا پڑتی ہو اس میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں) پر جمے رہے۔ جب والد کو ناخوش دیکھا تو بلا اطلاع کانپور اور وہاں سے پانی پت آ گئے۔ جن چیزوں نے اکثر آدمیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا آپ نے انہیں ٹھکرا دیا اور ذرہ بھر وقعت نہ دی۔

لکھنؤ میں جب آپ نہ دیکھے گئے تو ہر طرف تلاش شروع ہوئی۔ عشرت کدہ ماتم گاہ بن گیا۔ ہر طرف سوار پیادے دوڑائے گئے اور تین روز تک جستجو ہوتی رہی۔ اس کے بعد رحیم بخش عرف "کودو" گوجر نے جو آپ کا کوکا (دودھ شریک بھائی) اور اس راز سے واقف تھا کہا کہ آپ پانی پت چلے گئے ہیں' چنانچہ ادھر سوار دوڑائے گئے اور ان کے ساتھ ایک عریضہ مولوی برکت اللہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ آپ ان سے قبل پانی پت پہنچ چکے تھے اور پھر کسی طرح لکھنؤ جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

خواجہ علی اللہ اور خواجہ غلام حسین دونوں چچا خود لینے آئے لیکن آپ پھر بھی نہ گئے۔

طلباء کے پڑھانے اور ضروری مشاغل سے جو وقت بچتا تھا اسے محلہ کی بیواؤں اور لاوارث عورتوں کی خدمت میں صرف کرتے۔ باوجودیکہ بڑے زمیندار اور صاحب ثروت تھے اور متعدد رفقاء و ملازمین و خدمت گار رکھتے تھے مگر ان کا پانی خود بھرتے تھے اور ان کا سودا سلف اپنے آپ خرید کر لاتے۔ ان کی دوا دارو خود کرتے۔ ڈپٹی ماد ہوپر نے سبب پوچھا تو فرمایا "یہ آدمی میرے کام کے لیے ہیں اور میں ان کو اس کا معاوضہ دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مزید معاوضہ کے بغیر ان مستورات کی خدمت وہ دلی خواہش اور خندہ پیشانی سے نہیں کر سکتے اور میں مزید بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور اندیشہ ہے کہ وہ لوگ ان کی دل آزاری کریں گے۔ لہٰذا ان کا کام میں خود کرتا ہوں اور خدا سے اجر اخروی کا خواستگار ہوں۔"

پانی پت کی جامع مسجد سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۶ء / ۴۰۷ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ آٹھ سو برس تک اس نے کام دیا مگر آخرکار امتداد زمانہ نے اس کو خستہ کر کے منہدم کر دیا۔ آپ نے اور مولانا (عبدالرحمٰن انصاری) محدثؒ نے اس کو ازسرنو تعمیر کرایا اور حالات حاضرہ کے مطابق اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ ضروریات تعمیر کی فراہمی اور دیکھ بھال آپ خود کرتے تھے۔ ایام غدر میں کوئی صاحب شام کے وقت مسجد میں آئے اور معتد بہ سونا اور بعض دیگر قیمتی اشیاء آپ کو امانتاً دے گئے۔ آپ نے اس امانت کو اپنے مردانے مکان میں خود دفن کر دیا۔ وہ صاحب ایسی عجلت میں تھے کہ اپنا پتہ وغیرہ بھی کچھ نہ بتایا۔ پھر عرصہ تک نہ واپس آئے، نہ کوئی خبر بھیجی۔ آپ ان کی واپسی کے منتظر رہے۔ دن گزرتے گئے۔ کئی برس کے بعد وہ آئے مگر اس وقت ان کو نہ وہ مسجد یاد رہی اور نہ آپ کا نام۔ بدقت تمام وہ مسجد تک پہنچ گئے مگر آپ کو پہچان نہ سکے۔ آپ نے جب ان کو مغموم دیکھا تو حال پوچھا۔ جب معلوم ہوا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو امانت رکھا گئے تھے اور اپنے مال و متاع کے یوں گم جانے پر پریشان

ہیں تو اپنا تعارف کرایا اور ان کو ساتھ لے جا کر ان کی موجودگی میں تمام زر و سامان نکال کر ان کے حوالہ کیا اور باوجود ان کے اصرار کے کوئی شے ہدیتاً" قبول نہ کی۔

باوجود ضرورت اور مقتضائے وقت کے' حکام کے پاس کبھی نہ جاتے تھے بلکہ بلانے پر بھی ٹال دیتے تھے اور آخر تک اسی روش پر قائم رہے۔ ہر ہفتہ وعظ کہتے تھے جو نہایت دلپذیر و دلکش ہوتا تھا۔ میاں عبداللہ نومسلم جو آپ کے خاص رفیق تھے' آپ کے وعظ ہی کے اثر سے مسلمان ہوئے تھے اور ہمیشہ خدمت میں رہے۔ خاکسار (مولفؒ) نے میاں صاحب موصوف کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ بالکل ناخواندہ تھے۔ آپ کی صحبت نے ایسا اثر ڈال دیا تھا کہ آپ کے متعدد مکمل وعظ--- غزوات نبی صلی اللہ علیہ وسلم' فتوح شام و عراق و مصر اور ارض بلنیہ وغیرہ کے بہت سے واقعات برزبان یاد تھے۔ عم کا سپارہ' قرآنی دعائیں اور ادعیہ ماثورہ آپ نے یاد کرا دی تھیں۔ ساٹھ برس تک نماز پنجگانہ کے علاوہ نماز اشراق و تہجد بھی فوت نہیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ تہجد کے وقت انتقال ہوا اور بلا اختیار ہاتھ باندھ لیے اور قرأۃ پڑھتے ہوئے روح پرواز کر گئی۔

میرے (مؤلفؒ کے) چھوٹے ماموں حافظ احمد اللہ علیل تھے۔ آپ ان کا علاج معالجہ کرتے اور دعا کرتے کہ خداوندا مجھے اس کا داغ نہ دکھائیو۔ چنانچہ یکلخت آپ بیمار ہوئے اور ۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ اپنی مسجد موسومہ "جالیوں والی" میں دفن ہوئے۔ دو صاحبزادے' مولوی حافظ محمد سلامت اللہ اور حافظ احمد اللہ اور دو صاحبزادیاں بی بی رقیہ خاتون اور بی بی مریم خاتون باقی چھوڑیں۔ چاروں کو قرآن حفظ پڑھایا تھا۔ حافظ احمد اللہ نے حافظ عبدالغفار سے قرآن پڑھا اور مولانا (عبدالرحمٰن انصاری) محدثؒ سے تجوید اخذ کی۔ افسوس کہ اپنے والد ماجد سے چھ ماہ بعد ایک صاحبزادی چھوڑ کر عین شباب میں انتقال کیا اور اپنے باغ موسومہ "درزی والا" میں دفن ہوئے۔

مولوی حافظ سلامت اللہ نے قاری ممتاز علیؒ سے قرآن پڑھا۔ قاری لالاؒ اور

مولانا محدثؒ سے تجوید اخذ کی۔ درسیات کی اپنے والد اور مولانا محدثؒ سے تحصیل کی۔ قرآن پڑھنے کا طریقہ ادا اور لہجہ ممتاز اور معاصرین میں مشہور تھا۔ رمضان المبارک کا زیادہ وقت قرآنی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ قرآن سننے اور سنانے میں رات کے بارہ بج جاتے تھے۔ ۲۹ر رمضان ۱۳۱۹ھ مطابق ۲ر جنوری ۱۹۰۴ء کو شب کے وقت چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑ کر انتقال کیا اور حضرت مولانا محدثؒ کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

قاری ممتاز علی بن خواجہ غلام محی الدین

۱۸۰۵ء / ۱۲۲۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ قاری قادر بخشؒ سے تجوید اخذ کی' نیز قاری لالاؒ سے بھی اکتساب کیا۔ طریقہ ادا میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ قاری نجیب اللہؒ اور مولانا محدثؒ جیسے اساتذہ اور بزرگ بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔ قاری محمد علی کے بعد تعلیم قرآن کا مرجع تھے۔ نہایت نازک مزاج تھے' غصہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ میرے بڑے ماموں مولوی حافظ سلامت اللہ' قاری حافظ محمد حسن' مولوی انوار الاسلام' مولوی خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ بزرگوں نے آپ سے قرآن پڑھا تھا اور اس پر فخر کرتے تھے۔

میرے نانا صاحب نے ۱۵ سیر گھی ماہوار مقرر کر رکھا تھا۔ اگر یکم کو گھی نہ پہنچتا تو آپ ماموں صاحب کو قرآن شریف دے کر رخصت کر دیتے۔ یہی حال مولانا محدثؒ کے ساتھ تھا۔ حضرت مولاناؒ قاری محمد حسن کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ آپ نے بلانے کے لیے ایک طالب علم بھیجا۔ قاری صاحب نے کہہ دیا اس کی چھٹی بند ہے کیونکہ سبق یاد نہیں ہوا۔ اس طالب علم نے صرف اتنا پیغام دیا کہ سبق سنا کر آئیں گے۔ مولاناؒ ٹہلتے ٹہلتے خود تشریف لے گئے اور باہر سے پکارا۔ قاری صاحب نے آواز پہچان کر وہ صلواتیں سنائیں کہ مولانا فوراً واپس تشریف لے گئے اور پھر دوسرے وقت آکر خود معذرت کی۔

شہنشاہ بابر کے زمانہ سے خطابت عیدالفطر کی خدمت آپ کے خاندان میں چلی

آتی تھی۔ اس کے متعلق مختلف سلاطین کے متعدد فرامین آپ کے گھر میں ۱۹۴۷ء تک موجود تھے۔ خدا جانے ان کے اخلاف اس ابتلائے عظیم میں انہیں بچا کر لا سکے یا نہیں۔

۱۲۷۸ھ مطابق ۶۱ - ۱۸۶۰ء پانی پت میں انتقال کیا اور عظیم شاہؒ کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ حافظ عبدالسلام ایک فرزند اور بی سعید النساء جو کلام اللہ کی حافظہ تھیں' باقی چھوڑیں۔ قاضی عبدالسلام نے ۲۷ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ مطابق جون ۱۸۷۱ء عین عالم شباب میں دو فرزند ظہیر الاسلام اور نصیر الاسلام چھوڑ کر وفات پائی۔ افسوس کہ نصیر الاسلام ایک لڑکی چھوڑ کر ۱۹۱۴ء ۱۳۳۲ھ اور حافظ ظہیر الاسلام ۱۹۲۰ء ۱۳۳۸ھ میں لاولد فوت ہوگئے۔ بی سعید النساء نے تمام عمر خدمت قرآن میں گزاری اور صدہا بچوں اور بچیوں کو قرآن پڑھایا۔ ۱۸۹۷ء ۱۳۱۵ھ میں وہ بھی ایک لڑکا امین الدین چھوڑ کر مر گئیں اور وہ ۱۹۲۴ء ۱۳۴۳ھ میں ایک بیٹی چھوڑ کر مر گئے اور ان دو بچیوں کے سوا قاری صاحبؒ کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ سچ ہے' سدا رہے نام اللہ کا!

حافظ مرید حسین بن حافظ مانی عثمانیؒ

آپ قاری نور الہدیٰ کے والد ہیں۔ ۱۸۱۰ء ۱۲۲۵ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ یہ حضرت قاضی ثناء اللہ محدثؒ صاحب تفسیر مظہری کی وفات کا سال ہے۔ اپنے والد ماجد حافظ مانیؒ سے قرآن پڑھا اور تجوید سیکھی' پھر قاری لالاؒ سے اکتساب کیا۔ ایثار اور پرہیزگاری میں پدر گرامی قدر کے سچے جانشین تھے۔ گھر میں زیادہ تر جو کھائے جاتے تھے۔ اس میں سے پہلے غریب طلباء کو کھلاتے تھے پھر خود کھاتے تھے۔

تمام عمر خدمت قرآن میں گزاری۔ طلباء کو جس شفقت و محبت سے آپ تعلیم دیتے تھے' وہ آپ کا خاص حصہ تھا۔ غبی (کند ذہن) اور ناواقف اور سخت زبان طلباء کو دس بیس مرتبہ بتلانے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ غلط پڑھنے والوں پر نکتہ چینی نہ کرتے تھے اور نہ مجودین کو ان پر ترجیح دیتے تھے۔ اگر کوئی آپ کے صاحبزادے قاری نورالہدیٰ کے پڑھنے کی تعریف آپ کے سامنے کرتا تھا تو فرماتے "قرآن پڑھنے میں سب برابر ہیں۔ نور اللہ کی کیا خصوصیت ہے"۔ رمضان المبارک میں رات کے دو بجے تراویح سے فارغ ہوتے تھے۔ ایک خادم خاص دین محمد نامی کے سوا اور کوئی شخص تراویح میں آپ کا قرآن سننے کی ہمّت نہ رکھتا تھا۔

چچا حکیم احسن اللہ سے جب مسجد مخدوم صاحبؒ چھن گئی تو وہ آپ کے ساتھ قرآن سنانے لگے۔ ان کو قرآن سے عشق تھا۔ روزانہ منزل پڑھتے تھے اور رمضان

المبارک میں تمام دن یاد کرتے تھے مگر حافظہ اس قدر کمزور تھا کہ ہر آیت میں بھولتے تھے اور بغیر کسی زبردست سامع کے سنا نہیں سکتے تھے۔ اس کے ساتھ حکیم صاحب کو عرس دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔

حضرت شرف الدین بوعلی قلندر قدس سرہ کا عرس رمضان المبارک میں ہوتا تھا' چنانچہ ان دنوں میں چار پانچ روز تک غائب رہتے۔ اس کے بعد مسجد میں کراہتے ہوئے پہنچتے۔ آپ دریافت کرتے "میاں احسن' تم کئی روز سے کہاں ہو؟" وہ کہتے "چچا جی' مجھے بخار ہوگیا تھا"۔ آپ معذرت کرتے اور فرماتے "بھئی ہمیں خبر نہ ہوئی ورنہ تمہارا مزاج پوچھنے آتے"۔ یہ چشم پوشی اور درگزر کی اعلیٰ مثال ہے۔

آپ کو گوناگوں امراض لاحق تھے۔ پیشاب کا عارضہ تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں جوانی میں کسی شخص کی گاڑی کو جو کھانچہ میں پھنس گئی تھی براہ ہمدردی کمر پر اٹھا کر نکال دیا تھا' اس سے کمر میں ضرب آ گئی اور پھر اس کے بعد سیدھی نہ ہو سکی۔ ان تمام مصائب کے باوجود مجاہدہ اور معمول میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ بار بار وضو کرنا پڑتا تھا۔ طویل عمر پا کر ۱۸۸۳ء ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا۔ دو صاحبزادے قاری نور الہدیٰ جن کا ذکر آئندہ آئے گا اور حافظ احمد علی اور ایک صاحبزادی ملانی محمدی یادگار چھوڑیں۔ چھوٹے صاحبزادے ریاست ٹونک میں رہتے تھے اور وہیں خدمت قرآن میں مصروف تھے۔ خدا جانتا ہے ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی اولاد کا کیا بنا۔

ملانی جی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتی رہیں۔ پانی پت میں بچیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں اور بیشتر وقت ریاضت و مجاہدہ میں گزرتا تھا۔ وفات تک اسی معمول پر قائم رہیں۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

قاری عبداللہ بن قاری محمدی انصاریؒ

آپ حضرت مولانا عبدالرحمٰن محدث انصاریؒ کے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۸۰۸ء/ ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے قرآن پڑھا اور ابتدائی کتابیں حاصل کیں۔ چچا بزرگوار کو سنایا۔ حافظہ بڑا زبردست تھا اور طریقہ ادا و لہجہ نہایت دلکش۔ تجوید میں بعض فروگزاشتیں ہوتی تھیں لیکن مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ صوبہ بہار میں رہے' پھر پانی پت آ گئے اور میرے نانا مولوی اکرام اللہ صاحبؒ کے مکان معروف "بی سیدن والا" میں پڑھایا کرتے تھے۔ قاری ممتاز کے بعد بچوں کی تعلیم کا آپ واحد مرجع تھے۔ پانی پت میں شبینہ کو آپ نے رواج دیا۔ آپ سے پیشتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ آخر وقت تک قرآن کی خدمت میں کمربستہ رہے۔ آپ کے متعدد شاگرد پانی پت میں ۱۹۴۷ء تک آپ کے حسن ادا کی نمائندگی کرتے رہے۔

آپ بڑے شہ زور پہلوان اور کثیر الخوراک تھے۔ کہتے ہیں ایک وقت میں دیگر چیزوں کے علاوہ سیر بھر اصلی گھی کھا لیتے تھے۔ نانا صاحب کے یہاں جمعہ کا ایک شہتیر لایا گیا۔ ملازمین نے غفلت سے اسے رات کو سڑک میں چھوڑ دیا۔ مسجد سے آتے ہوئے آپ کو اس سے ٹھوکر لگ گئی۔ غصہ میں اسے تنہا اٹھا کر دور پھینک آئے۔ صبح کو جب اس کی تلاش ہوئی تو واقعہ معلوم ہوا۔ سننے والے اس شہ زوری پر حیران رہ گئے۔ ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۸ھ میں بعمر ۷۵ سال (قمری حساب سے) پانی پت میں وفات پائی۔ حکیم حافظ انعام اللہ اور حافظ خلیل اللہ دو بیٹے اور ایک بیٹی پیچھے چھوڑیں۔ حکیم انعام

اللہ نے بیٹیاں چھوڑ کر اور حافظ خلیل اللہ نے ایک بیٹا خواجہ احسان اللہ چھوڑ کر قضا کی۔ سال وفات تحقیق نہ ہوسکا۔

آپ کے سب سے چھوٹے بھائی حافظ عبدالعزیز آپ کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ وہ ۱۸۲۵ء ۱۲۴۰ھ میں والد کے انتقال کے چند دن بعد پیدا ہوئے اور چچا سے قرآن پڑھا۔ ۱۸۷۹ء ۱۲۹۶ھ میں لاولد فوت ہوگئے۔

حافظ عبدالرحیم بن قاری محمدی انصاریؒ

حضرت مولانا محدثؒ کے چھوٹے بھائی ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ چچا بزرگوار سے قرآن پڑھا۔ اعظم گڑھ چلے گئے تھے۔ وہیں قرآن پڑھاتے تھے اور کسی رئیس کی لڑکی سے شادی ہوگئی تھی۔ اس سے ایک لڑکا عبدالعلیم اور ایک بنی مسماۃ زینب پیدا ہوئی۔ ۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ میں قمری صاحب سے ستر سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ صاحبزادی کا عقد حضرت مولانا محدثؒ نے اپنے چھوٹے صاحبزادے قاری عبدالعلیم سے کر دیا تھا۔ وہ بھی چچا کے پاس اعظم گڑھ چلے گئے تھے اور وہیں وفات پائی۔ ۱۹۴۷ء تک ان کی نسل وہاں آباد تھی' پھر خدا جانے ان پر کیا بیتی۔

حافظ قاری نورالہدیٰ بن حافظ مرید حسین بن حافظ مانی عثمانیؒ

قاری صاحب موصوف ۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ قاری عبداللہ سے قرآن پڑھا۔ قاری نجیب اللہ اور اپنے والد ماجد سے تجوید حاصل کی۔ مولوی محب اللہ وغیرہ بزرگوں سے ابتدائی درسیات حاصل کیں اور خوش خطی سیکھی۔ ۱۸۷۸ء / ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محدثؒ سے سبعہ قرأت پڑھیں۔ قاری عبداللہ کے طریقہ ادا اور لہجہ کو اختیار کر کے انتہائی کمال پر پہنچایا۔ قرآن پڑھنے کا طریقہ نہایت عجیب اور لحن اتنا پاکیزہ تھا کہ سننے والے بے خود ہو جاتے تھے۔ بڑھاپے تک آواز ایسی صاف' بلند' باریک' لوچدار اور نازک تھی کہ معصوم بچوں میں بھی نہیں سنائی دیتی۔ ناواقف سننے والا صورت دیکھنے سے قبل محض آواز سن کر آپ کی عمر کا ۱۵ سال سے زیادہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا اور جب شکل دیکھتا تھا تو حیران ہو جاتا تھا۔ احقر کی عمر آپ کے انتقال کے وقت دس سال کے قریب تھی اور پندرہ سپارے پڑھ چکا تھا۔ ہم چند استاد بھائی رمضان المبارک میں روزانہ آپ کا (قرآن پڑھنا) سننے جایا کرتے تھے۔ ہمارا لڑکپن تھا۔ کچھ شعور نہ رکھتے تھے لیکن سب سے پہلے جب آپ کی آواز کان میں پڑی تو جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے اور آج تک وہ آواز کانوں میں گونجتی ہے اور دل میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو کر ہیجان بپا کر دیتی ہے۔ بقول سودا ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس کے بعد تمام دن ہم آپ کا ذکر کرتے رہتے اور رات کو جب سننے جاتے تو ایک خاص سرور حاصل ہوتا تھا۔ شائقین جب مسجد میں داخل ہوتے تو زبان حال سے عرض کرتے۔

وقت عزیز رفت بیا تا قضا کنیم
عمریکہ بے حضور صراحی و جام رفت

(عمر کا وہ حصہ جو جام و صراحی کے بغیر گزرا گویا ضائع ہوگیا۔ تو آ جائے اس وقت کی قضا کرلیں)

حقیقت یہ ہے کہ جو الحان آپ کو منجانب اللہ عطا ہوا تھا' وہ آپ کا خاص حصہ تھا۔ جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بُود! (یہ ایسا ملبوس تھا جو خاص اس محبوب ہی کے جسم کے لیے سیا گیا تھا) بعض باتوں میں اصول تجوید سے باہر ہو جاتے تھے لیکن آپ کے طریقہ ادا میں وہ فروگزاشتیں چھپ جاتی تھیں اور سوائے اعلیٰ ماہر کے کوئی شخص ان کو معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

ایک صاحب شروع رمضان میں پردیس سے قرآن سننے کے لیے پانی پت آئے اور سوئے اتفاق سے پہلے حضرت قلندر صاحب کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک بزرگ قرآن سنا رہے تھے۔ نہ ان کو تجوید کا شعور تھا اور نہ ان کی آواز مناسب تھی۔ ان صاحب نے کچھ دیر کھڑے ہو کر سنا اور پھر کہا "واہ واہ' اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ دنیا میں دھوم مچا دی کہ پانی پت ایسا اور پانی پت ویسا۔ سچ ہے دور کے ڈھول سہانے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا"

حافظ سعد اکرم مرحوم کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ الفاظ سن لیے' فوراً ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا "جناب یہ حافظ دیہاتی ہے' چلئے آپ کو پانی پت کے قاری کا قرآن

سناؤں"۔ اور ان کو درگاہ مخدوم صاحب میں لے آئے۔ وہاں قاری نور الہدیٰ صاحب پڑھ رہے تھے۔ وہ پردیسی سنتے ہی مبہوت و بے خود ہوگئے اور جہاں کھڑے ہوگئے تھے' اس جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ جب آپ ختم کر چکے تو حافظ سعد اکرم نے پوچھا "کیوں صاحب' حضرت جبریلؑ اسی طرح قرآن لاتے تھے؟" انہوں نے کہا "بیشک' میں بھی حافظ ہوں اور قرآن سننے کے لیے ہر جگہ جاتا ہوں مگر میں نے آج تک اس طرح کا قرآن نہیں سنا اور ایسے قراء کے وجود پر پانی پت جس قدر فخر و مباہات کرے وہ بجا ہے۔ میں نے جیسا سنا تھا اس سے زیادہ پایا"۔

ایک مرتبہ آخر شعبان میں آپ اپنے آلات جلد سازی درست کرانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور ارادہ کے خلاف زیادہ ٹھہرنا پڑا۔ رمضان کا چاند دیکھ کر آپ جامع مسجد میں پہنچے' وہاں متعدد آدمی قرآن سنایا کرتے تھے۔ آپ نے بھی حوض کے قریب کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ وضو کرنے والے صاحبان نے جو وہ مقدس آواز سنی تو ہر جگہ جا کر مقتدیوں کے کان میں کہہ دیا "میاں' حوض کے کنارے ایک آسمانی قاری قرآن پڑھ رہے ہیں"۔ ہر شخص نیت توڑ کر آپ کے ساتھ شریک ہوگیا اور جب حفاظ نے سلام پھیر کر دیکھا کہ ان کے پیچھے کوئی نمازی باقی نہیں اور تمام لوگ حوض کے پیچھے قرآن سن رہے ہیں تو وہ سب بھی وہیں آگئے اور آپ کا سننے لگے۔

بیک آمدن ربودی دل و دین دو صد چو خسرو
چہ شود اگر بدیساں دو سہ بار خواہی آمد

(ایک ہی دفعہ آ کر خسرو جیسے صدہا فقیروں کے دل و دین چھین لیے۔ اگر اسی طرح دو تین بار آنا ہوگیا تو کیا ہوگا)۔

دلی میں دھوم مچ گئی۔ نمازیوں میں میاں الٰہی بخش' آپ کی شاگردہ شمس النساء کا خاوند بھی تھا۔ ان مسماۃ کی والدہ غدر میں پانی پت آگئی تھیں۔ انہوں نے اپنی لڑکی کو آپ سے قرآن پڑھوایا تھا۔ اس کے بعد وہ دہلی چلی گئیں اور پھر ایک کو دوسرے کی

خبر نہیں ہوئی۔ اس موقعہ پر جب اس نیک بخت کے شوہر نے گھر میں جا کر اس اجنبی قاری کا ذکر کیا تو وہ سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ میرے قاری صاحب ہیں۔ اسی وقت اپنے خاوند اور بیٹے کو نادری حکم دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ بصد منت و آرزو آپ کو گھر لے گئے اور مسماۃ دیکھتے ہی قدموں میں گر پڑی اور خوشامد کر کے ایک قرآن اپنے گھر پر پڑھوایا۔ اپنی رشتہ داروں اور ملنے والیوں کو جمع کیا۔ ختم کے دن معقول رقم اور جوڑے نذر کیے لیکن آپ نے کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب حد سے زیادہ اصرار ہوا تو صرف کپڑے لے لیے۔ وہ مسماۃ بھی اپنی دھن کی پکی تھی' اس نے وہ رقم مولوی حبیب اللہ مرحوم کی معرفت بتدریج آپ کے گھر میں پہنچا دی۔

بعض حضرات نے محض آپ کے طریقہ ادا اور لہجہ کی پیروی کے لیے جدوجہد کی۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے' ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر کسی خوبی کی نقل نہ کر سکے۔ بقول ذوق ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ابتداء" آپ پہلا قرآن اپنی مسجد میں اور چچا حکیم احسن حضرت مخدوم صاحبؒ کی مسجد میں سنایا کرتے تھے اور مولوی حبیب اللہ صاحب مانک چوک کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ ایک روز اس کی متولیہ نے کہہ دیا کہ اب کی بار ہم کسی خوش الحان قاری سے قرآن پڑھوائیں گے۔ یہ قصہ رمضان سے قبل مولوی صاحب کو معلوم ہوگیا۔ انہوں نے حافظ سعداللہ' مولوی راغب اللہ وغیرہ چند بزرگوں کو جمع کر کے کہا کہ اس سال وہاں قرآن نہیں پڑھ سکتا۔ مناسب یہ ہے کہ قاری نورالہدیٰ حضرت مخدوم صاحب کی مسجد میں سنائیں کیونکہ ان کی مسجد بہت چھوٹی ہے۔ میں ان کی مسجد میں سنا لوں گا' حکیم جی اپنا کہیں اور ٹھکانا کر لیں گے۔ آپ سے کہا گیا تو آپ نے اس تجویز کو منظور کر لیا' پھر حکیم جی کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا "کیسے قاری

نورا لہدیٰ اور کون مولوی حبیب اللہ۔ اپنے دادا کی مسجد میں میں خود سناؤں گا"۔ بہت کچھ منت سماجت کی گئی مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اس پر سب حضرات نے آپ سے اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی استدعا کی۔ آپ نے اقرار کر لیا اور یہ تجویز پختہ ہو کر جمعہ میں اعلان کر دیا گیا۔ حکیم جی نے سنا تو آپ کے پاس آئے اور کہا کہ "بھائی صاحب آپ بڑے ہیں مگر دادا کی مسجد ہرگز نہیں چھوڑوں گا"۔ آپ نے فرمایا "اچھا بھائی' رمضان آنے دو' دیکھیں گے"۔ غرض حکیم جی نے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا اور مورچہ بندی میں مشغول ہوگئے۔ خود حکیم جی اس معرکہ آرائی اور اپنی شکست کی کیفیت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"چاند دیکھ کر میں نے جھٹ پٹ غسل کیا اور نئے کپڑے پہن کر مسجد میں پہنچ گیا اور میدان خالی دیکھ کر خوش ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد نمازی آنے شروع ہوگئے اور مسجد بھر گئی۔ میں نے ہرچند سمجھایا کہ یہاں قاری صاحب نہیں سنائیں گے لیکن کسی نے باور نہ کیا۔ اذان کے وقت قاری صاحب بھی آ گئے اور میرے قریب بیٹھ کر وضو کرتے ہوئے فرمایا "کیوں بھئی احسن' کیا ارادہ ہے؟" میں نے بڑے زور سے کہا "بھائی صاحب' اس مسجد میں قرآن تو میں سناؤں گا"۔ فرمایا "اچھی بات ہے آپ کا دم خم دیکھیں گے"۔ خیر بھئی خدا خدا کر کے اذان' نماز اور سنتوں سے فراغت پائی اور میں نے جلدی سے مصلے پر قبضہ کر کے گویا اپنا جھنڈا نصب کر دیا اور نیت باندھ کر قرآن پڑھنے لگا۔ میں اپنی کامیابی پر نازاں تھا اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ "میں نے فتح پائی اور قاریوں اور مولویوں کو شکست ہوگئی"۔ کہ اچانک قاری صاحب میرے برابر آ کر کھڑے ہوگئے اور انہوں نے بھی ہاتھ باندھ کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ اب تو میں گھبرایا کہ ایک محراب میں دو امام کیسے۔ ادھر "**لا یومنون**" تک پڑھ کر میں بھول گیا۔ کئی مرتبہ لوٹا لوٹا کر پڑھا مگر آگے نہ چل سکا۔ معلوم ہوا میرا سامع بھی

کہیں غائب ہوگیا۔ مجبور ہو کر میں نے رکوع کر دیا اور بھئی رکوع میں میں نے دائیں بائیں جھانک کر دیکھا کہ کسی نمازی نے بھی میرے ساتھ رکوع کیا ہے یا نہیں لیکن کسی نمازی نے رکوع نہیں کیا تھا۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہوا اور میں نے نیت توڑ دی اور جوتیاں لے کر چل پڑا۔ غرض اس طرح جیتی ہوئی بازی ہار بن گئی اور مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ جب میں فصیل تک پہنچا تو قاری صاحب نے پکارا "میاں احسن کہاں چلے۔ نمازی زیادہ ہیں' ایک امام سے کام نہیں چلے گا"۔ خیر' قہر درویش بر جان درویش میں چلا آیا اور حافظ (مرید حسین) صاحب کے ساتھ قرآن سنانے لگا"۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ پانی پت اگرچہ قصبہ تھا لیکن مساجد بے شمار تھیں۔ غالباً لی سے جامعہ ملیہ کے طلباء کی ایک جماعت نے آکر مساجد کا سروے کیا تھا اور چھوٹی بڑی تقریباً آٹھ سو مساجد شمار کیں۔ ان میں سے متعدد مساجد کے ساتھ تو قرآن کے مدارس منسلک تھے۔ قی مساجد سے ملحق حجروں میں بیرون سے آئے ہوئے قرآن پڑھنے والے طلبہ رہتے تھے۔ ان لباء کی کفالت اہل محلّہ کرتے تھے۔ خوش حال گھرانوں سے ان کا کھانا مقرر ہو جاتا تھا جو وہ دو نت آکر لے لیا کرتے تھے۔ ڈپٹی مولوی نذیر احمد نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے لہ وہ بھی اسی طرح پڑھے اور دو وقت کا کھانا محلّہ کے گھروں سے لایا کرتے تھے۔ تقریباً ان تمام ساجد میں رمضان المبارک میں حفاظ تراویح میں قرآن سنایا کرتے تھے۔ کچھ مساجد تو مشہور اور م تھیں جیسے درگاہ حضرت مخدوم صاحبؒ کی اور درگاہ حضرت قلندر صاحبؒ کی مساجد' ان میں ماتذہ ہی سناتے تھے۔ اکثر مساجد میں خاندانی نسبت یا قدیمی تعلق کی بنا پر سنانے والے مستقلاً" یض تھے۔ مثلاً ہمارے پرنانا کی مسجد نواب والی مسجد کہلاتی تھی۔ جب ہم سب بھائی حافظ ہوگئے بمشکل ہم نے اسے قبضہ مخالفانہ سے خالی کرایا اور ۱۹۴۷ء تک میں اور میرے بڑے بھائی اس ں محراب سناتے تھے۔ لیکن حفاظ کی تعداد ماشاء اللہ اتنی تھی کہ ایک ایک مسجد میں دو دو حفاظ ے پڑھنے کے باوجود بہت سے حفاظ اس سعادت سے محروم رہ جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ں دیہات کا رخ کرتے تھے اور کچھ اہل ثروت کے گھروں پر سنا لیا کرتے تھے۔ عموماً قرآن ۔ ۲۱ ویں شب کو ختم کرنے کا دستور تھا۔ بعض مساجد میں ۲۵ ویں شب کو بھی ختم ہوتا تھا۔

۲۱ ویں شب سے شبینوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور تمام رات قرآن کی تلاوت کی جاتی تھی۔ حفاظ تنہا بھی اور ٹولیوں میں بھی گھومتے پھرتے تھے اور جہاں موقع مل جاتا تھا' کھڑے ہو کر ایک دو سپارے بلکہ بعض اس سے زیادہ بھی پڑھ لیتے تھے۔ ان میں سے بعض شبینے بہت مشہور تھے اور ان میں پڑھنا خصوصی امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ایسا ایک شبینہ تو حضرت مولانا محدث انصاری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر ہوتا تھا۔ دوسرا بڑے امام صاحب کی درگاہ پر' تیسرا جامع مسجد میں اور چوتھا ہمارے گھر پر۔ ان میں سے دو شبینوں میں یعنی حضرت مولانا محدثؒ کے مزار پر اور ہمارے گھر میں ابا جان ضرور پڑھتے تھے' اس لیے سننے والوں کا بھی اجتماع ہوتا تھا اور بڑے بڑے قراء صاحبان بھی عقیدت و محبت کے تعلق کی وجہ سے ضرور آتے تھے۔ اس تفصیل کے بعد اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں۔

حضرت قاری نور الہدیٰؒ کی عادت تھی کہ پہلے مخدوم صاحبؒ کی مسجد میں' پھر اپنے گھر میں' پھر مسجد قلندر صاحبؒ میں اور اس کے بعد ایک قرآن بلا تعین مقام سناتے تھے اور ہر روز "فی بشوق" کی منزل پڑھتے تھے۔ (قرآن کریم کو پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے سات منازل میں تقسیم کیا گیا ہے کہ اگر ایک منزل روز پڑھی جائے تو سات دن یا ایک ہفتہ میں قرآن کریم مکمل ہو جائے۔ "فی بشوق" ان سات سورتوں کے پہلے حروف کا مجموعہ ہے جن سے یہ منازل شروع ہوتی ہیں۔ ف=فاتحہ' م=مائدہ' ی=یونس' ب=بنی اسرائیل' ش=شعراء' و=وَالصّٰفّٰتُ' ق=ق و القرآن المجید) اس کے علاوہ لوگوں کے اصرار سے شبینوں میں ایک ایک دو دو منزلیں پڑھ دیتے تھے۔ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ اور کمال یہ تھا آخر تک طریقہ ادا' لہجہ اور آواز میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اور تمام دن طلباء کی تعلیم اور حصول روزی میں صرف ہوتا تھا۔ پڑھنے سے قبل کمر میں ایک ڈوپٹہ کسوا کر بندھوا لیتے تھے۔ نہایت نحیف الجثہ اور کمزور تھے۔ غذا نہایت معمولی کھاتے تھے۔ قرآنی کمالات کے ساتھ عُسرت بھی ورثہ میں ملی تھی۔ صرف قوتِ ایمانی کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتے تھے۔ جب سے سبعہ قرأت

پڑھی تھیں ہر رمضان میں مختلف روایات سناتے تھے۔

آپ نے پنسار ہٹہ (کریانہ) کی ایک معمولی سی دکان کر رکھی تھی۔ اسی میں جلد سازی کیا کرتے تھے اور وہیں طلباء کو پڑھاتے تھے۔ کوئی چیز کسی ایسے آدمی کے ہاتھ فروخت نہیں کرتے تھے جس کی آمدنی مشتبہ ہو اور نہ اس کی جلد بناتے تھے۔ جو کچھ گھر میں پکتا تھا' پہلے طلباء کو کھلاتے تھے پھر خود کھاتے تھے۔ یہی حال گھر میں خواہر گرامی قدر کا تھا۔ خوش حال اعزہ اور تلامذہ ہرچند اصرار کرتے مگر آپ ان کا ہدیہ قبول نہ کرتے تھے۔ تمام عمر تجرد میں بسر کی۔ شادی نہیں کروائی۔ ایک مرتبہ مکان کی مرمت کرائی جو آپ کا اور مولوی راغب اللہ کا مشترک تھا اور استعمال میں آپ کے رہتا تھا۔ مولانا مصر ہیں کہ آدھا خرچ مجھ سے لے لیجئے اور آپ بار بار واپس کرتے ہیں اور کہتے ہیں' ہمارے استعمال سے قابل مرمت ہوا لہٰذا اس کا درست کرانا ہمارا فرض ہے۔ اللہ اللہ یہ تھا تقویٰ۔

۳ر شوال ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۳ر جون ۱۸۸۸ء کو ساٹھ برس کی عمر میں پانی پت میں وفات پائی۔

قاری سید فخرالدینؒ

چالیسویں پشت میں آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے اجداد میں سے مخدوم سید لطیف الحقؒ مدنی' جو اپنے وقت کے زبردست عالم اور فقیہ تھے' حجاز سے دلی آ گئے۔ قاری صاحب موصوف ۱۸۴۹ء/ ۱۲۶۰ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ۸ سال کے تھے جو دلی پر غدر کی مصیبت پڑ گئی اور آپ کے والد ماجد مع اپنے اہل و عیال کے دلی کی سکونت ترک کر کے پانی پت آنے پر مجبور ہوگئے اور اس قصبہ کو اپنا وطن بنا لیا اور اہل قصبہ سے ایسا میل جول اور ربط پیدا کیا کہ یہیں کے باشندے بن گئے۔ کاتب الحروف (مؤلفؒ) کی دادی بی بی بادشاہ بیگم مرحومہ آپ کے والد سید محمد سعید الدین مرحوم کو اپنے فرزند کے برابر تصور کرتی تھیں اور آپ کی والدہ بی بی نواب بیگم مرحومہ کو بھی مثل بیٹی کے جانتی تھیں اور وہ دونوں انہیں اپنی خالہ سمجھتے تھے اور دونوں گھرانوں میں محبت کا میل ملاپ دو نسلوں تک (یعنی حضرت مولفؒ کے زمانہ تک) قائم رہا۔

آپ نے پانی پت میں ہوش سنبھالا اور قرآن شریف ناظرہ پڑھنے کے بعد درسیات فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم پائی اور خوش خطی سیکھی۔ ۱۸۷۸ء/ ۱۲۹۵ھ میں میرے شیخ اور دیگر حضرات کے ساتھ مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ سے سبعہ قرأت پڑھیں اور تجوید اخذ کی۔ سبعہ کے متعلق کافی واقفیت رکھتے تھے۔ بعض طلباء نے آپ سے قرأت پڑھیں اور بعض نے مختلف روایات سنائیں۔ ۹۳-۱۸۹۲ء/

۱۳۰۹-۱۰ھ میں جب حضرت مولانا محدثؒ کے یہاں سبعہ کا آخری دور ہو رہا تھا تو آپ بھی اس کی سماعت میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔

آپ متوسط الاندام' میانہ قامت' سرخ و سفید' وجیہ و خوبصورت' سفید ریش' حد درجہ متین اور خاموش بزرگ تھے۔ صحبت نہایت پاکیزہ تھی۔ ماشاء اللہ صورت و سیرت' عادات و خصائل میں قدیم شرفاء دہلی کا نمونہ تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر پانی پت میں انتقال کیا۔ صحیح سال وفات کا تعین نہ ہوسکا۔ آپ کو امام زادہ سید بدرالدین قدس سرہ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ افسوس کہ چھوٹے صاحبزادے نے بھی عین شباب میں انتقال کیا۔

مولانا قاری سید گل حسن شاہؒ

آپ بنوں ٹانک ضلع ڈیرہ غازی خان صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور صحیح النسب سید تھے۔ نسب نامہ معلوم نہ ہوسکا کیونکہ اپنا احوال ظاہر نہ کرتے تھے۔ ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ اپنے مرشد کی سوانح "تذکرۂ غوثیہ" میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ "۱۳ برس کی عمر تک لہو ولعب کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا"۔ والد ماجد نے یہ حال دیکھ کر آپ کو مولوی عبدالغنی صدر مدرس اور مولوی احمد حسن نائب مدرس نارمل سکول کے پاس راولپنڈی بھیج دیا۔ جہاں آپ نے ایک سال کے بعد نارمل سکول کا امتحان پاس کر لیا اور بحیثیت مدرس ملازم ہوگئے۔ دو سال بعد حضرت آخوند عبدالغفور سے مرید ہوئے۔ اس کے بعد پانچ سال اور نوکری کی پھر حصول علم دین کی غرض سے مختلف مقامات میں پھرتے ہوئے (غالباً ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ میں) پانی پت پہنچے۔ بھوتوں والی مسجد میں قیام کیا اور مولوی فتح محمد صدیقی سے عربی پڑھنے لگے۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ مقدر کی یاوری نے حضرت مولانا سید غوث علی شاہ صاحب قلندری قادری قدس سرہ سے روشناس کرا دیا۔ حضور ممدوح کو پانی پت آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے۔ چھ سال عربی پڑھتے رہے' ہدایہ' بیضاوی' مشکوۃ اور بخاری تک تحصیل کی اور حضور موصوف سے تربیت باطنی حاصل کرتے رہے۔ ۶۹-۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں حج کو گئے۔ دو حج کیے اور دو دفعہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ چوتھے برس واپس پانی پت پہنچ کر حضور ممدوح سے خاندان قادریہ میں بیعت ہوئے۔ دو سال حاضر

رہ کر کابل چلے گئے اور دو سال سیاحت کرنے کے بعد ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ میں پانی پت آئے اور خاندان نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا اور ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے۔ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں میرے شیخ اور قاری نور الہدیٰ وغیرہ کے ساتھ حضرت مولانا محدثؒ سے سبعہ قرأت پڑھیں۔ مشہور اور صاحب تصنیف بزرگ ہیں۔ مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ کے خلیفہ اور دوسرے سجادہ نشین ہیں۔ ہزارہا مخلوق نے آپ سے فیض باطن اکتساب کیا۔ ۱۴ر صفر ۱۹۱۹ء ۱۳۳۸ھ کو پانی پت میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے شیخ کے مزار کے متصل بیرون احاطہ بجانب جنوب مدفون ہوئے۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ مولانا سید غوث علی شاہ صاحب قلندری قادری قدس سرہ بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں۔ چونکہ حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان سے بلاواسطہ فیض باطنی حاصل کیا تھا' اس لیے قلندری بھی کہلاتے تھے۔ شیخ سعدی کی طرح بڑے سیاح تھے اور نوع نوع کے مشاہدات سے گزرے تھے۔ پانی پت اور بیرون پانی پت میں ان کے ارادت مندوں کی بڑی تعداد تھی جو باقاعدگی سے ان کے عرس کا اہتمام کرتی تھی۔ حضرت قلندر صاحب کے مزار کے وسیع احاطہ میں جو بے شمار حجرے تھے ان میں سے ایک میں آپ نے مجاہدہ کیا تھا۔ وہ آپ ہی کے نام سے منسوب تھا اور میرے تایا جان حافظ محمد ابراہیم' جن کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا اور جو ان کے سلسلہ بیعت سے منسلک تھے' باقاعدگی سے ہر جمعرات کو اس حجرہ میں چراغ روشن کرتے تھے اور خوشبویات جلاتے تھے۔ مجھے بھی ایک بار ان کے ساتھ اس حجرہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ مغربی دیوار میں ایک سیاہ گول نشان تھا۔ تایا ابا نے بتایا کہ یہ حضرت غوث علی شاہ صاحب کے سر مبارک کا نشان ہے۔ اس جگہ پر سر ٹکا کر مراقبہ کرتے تھے۔ مولانا قاری سید گل حسن صاحبؒ نے اپنے مرشد کے احوال و کمالات پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "تذکرۂ غوثیہ" ہے۔ اہل حال کے لیے تو اس کتاب

میں رہنمائی کا بے حساب سامان ہے ہی' عام پڑھنے والے کے لیے بھی ازحد دلچسپ کتاب ہے۔ پاکستان میں شائع ہوچکی ہے۔

مولانا قاری فتح محمد بن صالح محمد بن محمد قائم صدیقیؒ

آپ کے دادا محمد قاسم ریاست ٹونک میں رسالدار تھے۔ آپ قاری شیخ احسان اللہ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ ۱۸۴۰ء ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل عالم تھے اور حضرت مولانا سید غوث علی شاہ صاحب قادری پانی پتیؒ سے شرف بیعت رکھتے تھے۔

۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں میرے شیخ اور قاری نور الہدیٰ وغیرہ بزرگوں کے ساتھ آپ بھی حضرت مولانا محدثؒ سے سبعہ پڑھنے میں شریک تھے۔ اسی دوران میں ۲۸ ربیع الاول ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ کو ہیضہ سے اچانک انتقال کیا۔

قاری محمد حسن بن مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری محدث پانی پتیؒ

قاری صاحب موصوف ۱۸۴۸ء/ ۱۲۶۴ھ بمقام باندہ پیدا ہوئے۔ قاری ممتاز علی صاحب سے سبقاً سبقاً قرآن پڑھا۔ پھر اپنے والد ماجد حضرت مولانا محدثؒ سے مشق کی اور پے در پے سنایا اور سبعہ قرأت پڑھیں۔ علوم رسمیہ بھی والد سے حاصل کیے مگر تکمیل نہ کر سکے۔ تجوید میں فضیلت اور قرأت میں بصیرت تامہ رکھتے تھے۔ قرآن پڑھنے کا لہجہ اور طریقہ ادا حضرت مولانا محدثؒ کے مشابہ تھا۔ جب نماز پڑھاتے تھے تو لگتا تھا حضرت ممدوح پڑھا رہے ہیں اور کیوں نہ ہوتا' آپ تیس سال سفر و حضر میں ہر وقت مولاناؒ کے ساتھ رہے' جس سے

ع "جمال ہمنشیں درمن اثر کرد"

کا مصداق بن گئے تھے۔

صورت سے ذہانت' منکینیت' دینداری اور للہیت برستی تھی۔ موجودہ اہل زمانہ کے مکر و فریب اور چالوں سے نا آشنا محض تھے۔ اکثر آدمی دھوکا دیتے تھے۔ آپ کسی مسلمان کو کبھی جھوٹا نہیں سمجھتے تھے۔

عرصہ تک تعلیم قرآن کے سلسلہ میں "گیا" واقع صوبہ بہار رہتے رہے اور وہاں پڑھاتے تھے۔ بعض ارباب خیر نے تعلیم قرآن کے واسطے ایک مدرسہ جاری کر رکھا تھا۔ آپ اس کے صدر مدرس تھے۔ قرب و جوار کی ان گنت مخلوق آپ سے قرآن و تجوید کا استفادہ کرتی تھی۔ احقر نے ۲۴ سال کا عرصہ ہوا (۱۸۹۸ء) آپ کی حیات میں

اس مدرسہ اور اس کے تلامذہ کو وہاں جا کر دیکھا تھا۔ تمام اہل علم اور شرفاء آپ کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۲۶ر شعبان ۱۳۳۲ھ بمطابق ۲ر جولائی ۱۹۱۴ء کو وہیں انتقال کیا۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادے محمد یونس ۴۷ء تک پانی پت میں آباد تھے۔ دو لڑکے "گیا" میں پیدا ہوئے اور وہیں فوت ہو گئے۔

احقر نے آپ کو روایت قالون سنائی تھی۔

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتیؒ

مولانا حالی بن حافظ خوجہ ایزد بخش ۱۸۳۷ء ۱۲۵۳ھ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ قاری ممتاز علی سے قرآن پڑھا' قاری لالاؒ اور مولانا محدثؒ سے تجوید اخذ کی۔ میر جعفر علی سے فارسی' مولانا خواجہ ابراہیم حسین' مولانا محدثؒ اور مولانا حاجی شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی سے عربی کی تحصیل کی۔ نیز مولانا محدثؒ سے ابتدائی حصہ سبعہ قرأت حاصل کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور میرزا غالب سے شعر کی تحصیل کی۔ قومی شاعر اور مصلح ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ہر گوشہ میں آپ کا نام مشہور ہوا۔ لیکن بہت کم آدمی آپؒ کے قرآنی کمالات سے باخبر ہیں۔ حتیٰ کہ خود پانی پت میں بعد کی نسل کے لوگ بھی اس سے بے خبر تھے اور یہ واقعہ ہے کہ آپ اس کو چھپاتے تھے۔ طریقہ ادا اور لہجہ خاص طور پر ممتاز تھا اور ۱۸۴۶ء ۱۲۸۰ھ تک قرآن سنانے کی غیر معمولی شہرت تھی۔ اس کے بعد آپ نے آہستہ آہستہ تلاوت کو تنہائی میں منحصر کر دیا۔ خاکسار راقم کو بارہا تلاوت کے وقت باریابی کا موقعہ ملا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ لحن داؤدی کے ساتھ قرآن پڑھ رہا ہے جس کو دنیا اور اہل دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔

مولوی قاری حافظ حکیم عبدالعلیم انصاریؒ

آپ حضرت مولانا محدثؒ کے چھوٹے فرزند تھے۔ ۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ تمام قرآن سبقاً سبقاً میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے پڑھا اور مشق و مذاولت (پختگی کے لیے سعی) کی۔ پھر اپنے والد ماجد کو پے در پے سنایا۔ ۱۸۸۳ء ۱۳۰۱ھ تک صرف قرآن کی خدمت کرائی گئی' اس کے بعد مولوی غلام احمد سے فارسی اور مولانا راغب اللہ وغیرہ علما سے عربی پڑھی۔ اور درسیات قریبِ تکمیل حاصل کیں۔ ۱۸۹۲ء ۱۰-۱۳۰۹ھ اپنے والد ماجد حضرت مولانا محدثؒ سے سبعہ پڑھیں۔ آپ کے ساتھ متعدد آدمی سماعت میں شریک تھے اور یہ حضرت ممدوحؒ کے یہاں سبعہ کا آخری درس تھا۔ پھر آپ نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خان مرحوم دہلوی سے طب کی تکمیل کی۔

تجوید اور قرأت کے فاضل اور ماہر تھے۔ حضرت مولانا محدثؒ کی حیات میں قرآن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ابتداءً صبح کے چند گھنٹے طبابت میں اور بعد کا وقت قرآن کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ والد ماجدؒ کی وفات کے بعد طب کو خیرباد کہہ دیا اور ہمہ تن خدمت قرآن میں مشغول ہوگئے۔ صدہا آدمیوں نے آپ سے قرآن اور قرأت پڑھیں۔ حدر (تیزی) کے ساتھ قرآن پڑھنے میں کمال حاصل تھا۔ شینوں میں بے تکلف' اصول تجوید کی پابندی کے ساتھ دس پندرہ سپارے ایک گھنٹہ میں چار سپارے کی رفتار سے پڑھ دیتے تھے۔

احقر سے بڑے تھے مگر سیر و شکار' کھیل کود اور نشست و برخواست میں ہم سنوں جیسا ربط ضبط اور بے تکلفانہ میل جول تھا۔ سالہا سال ایک جگہ اٹھتے بیٹھتے رہے اور رات کے چند گھنٹوں کے سوا جدا نہیں ہوتے تھے۔ رجب کے مہینے میں قرآن کا دور کرتے جو آخر رمضان تک جاری رہتا اور اکثر ایک جگہ روزہ افطار کرتے۔ رات کو اپنا اپنا (قرآن) سنانے کے بعد قراء کا سننے جاتے۔

طبیعت میں وہم تھا۔ بعض خاندانی نزاعات نے' جو دنیا داروں کو اکثر پیش آجاتے ہیں' اس کو مراق کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء ۱۳۲۴ھ میں اہلیہ کے فوت ہو جانے نے دنیا سے متنفر کر دیا۔ چنانچہ یکلخت بلا اطلاع عراق چلے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد آئے تو بدستور رنجیدہ تھے۔ عزیزوں نے دلبستگی کے لیے کیرانہ میں عقد کرا دیا۔ مگر آپ کا دل پانی پت سے بدستور متنفر رہا اور حجاز چلے گئے۔ تقریباً دس سال وہاں مجاہدہ کرتے رہے اور ۱۹۲۰ء ۱۳۳۸ھ میں مدینہ منورہ میں بعمر ۵۴ سال انتقال کیا۔ افسوس۔ ؎

مَاتَ الْمُبَرِّدُ وَانْقَضَتْ اَيَّامُهٗ
وَسَيَنْقَضِیْ بَعْدَ الْمُبَرِّدِ ثَعْلَبُ
بَيْتٌ مِنَ الْاٰدَابِ اَصْبَحَ نِصْفُهٗ
خَرِبًا وَّ بَاقِیْ نِصْفُهٗ لَسَيَخْرِبُ

(مبرد مرگیا اور اس کا عرصہ زندگی ختم ہوگیا۔ عنقریب ثعلب کے ساتھ بھی یہی پیش آنے والا ہے۔ علم و ادب کے محل کا نصف تو ویران ہوگیا باقی نصف بھی جلد ہی اجڑ جائے گا)۔

یہ رباعی امام نحو مبرد کی وفات پر اس کے حریف ثعلب امام عربیت و نحو نے لکھی تھی۔ اس کا پہلا شعر میرے اور میرے دوست قاری عبدالعلیم کے حسب حال ہے' اس کو پڑھ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔

آپ نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیچھے چھوڑیں۔ بڑا لڑکا عین عالم شباب میں

طاعون سے فوت ہوگیا۔ دوسرے مولوی قاری حافظ عبدالحلیم ہیں جو علوم درسی اور حفظ قرآن اور قرأت کی تحصیل سے فارغ ہوچکے ہیں۔ خدائے تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور نام آور بزرگ (یعنی ان کے دادا حضرت مولانا محدثؒ) کا جانشین بنائے' اور عجب و پندار سے محفوظ و مصوّن رکھے۔ آمین۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ مولانا عبدالحلیم صاحب نہایت نیک اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں انہیں دیکھنے اور ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی' جس مکتب میں میں نے قرآن شریف پڑھا وہ مدرسہ رحمانیہ کی شاخ تھا۔ یہ مکتب بڑوالی مسجد سے ملحق تھا اور اسی گلی میں مولوی حلیم صاحب رہا کرتے تھے۔ مسجد میں تمام نمازوں میں وہی امامت فرماتے تھے۔ لہٰذا عصر کی نماز تقریباً ہمیشہ اور ظہر اور مغرب کی نمازیں کبھی کبھی ان کی امامت میں ادا کیں۔ قرآن کی تلاوت بہت سادہ انداز میں کرتے تھے۔ کسی قسم کا تکلف اور بناوٹ نہیں تھی۔ جب ہمارے مکتب کے سالانہ امتحانات ہوتے تھے تو ان میں بھی حضرت ابا جان کے ہمراہ مولانا حلیم صاحب بطور ممتحن موجود ہوتے تھے۔ جب میں حال مسلم ہائی سکول میں پہنچ گیا تو ترجمۃ القرآن کی جماعت میں شرکت کا شرف نصیب ہوا' جس میں مولانا استاد تھے۔

اس سلسلہ میں چند جملے تمہیداً" عرض کر دوں۔ مولانا حالیؒ کی وفات پر جب ان کی یادگار قائم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو زعماء نے فیصلہ کیا کہ پانی پت میں ایک ہائی سکول ان کے نام سے قائم کیا جائے۔ اس وقت تک پانی پت میں مڈل کے بعد تعلیم کا انتظام نہ تھا' چنانچہ حال مسلم ہائی سکول قائم ہوا۔ یوں تو تمام اہل شہر ہی اس کار خیر میں اپنی اپنی بساط کے مطابق شریک تھے۔ لیکن اس تحریک کے خاص روح رواں مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ نہایت خوشنما عمارت علی گڑھ سکول کے نمونے پر شہر کے باہر جرنیلی سڑک کے کنارے ایک وسیع قطعہ اراضی پر تعمیر کی گئی جس کے ساتھ کشادہ کھیلوں کے میدان تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض

سے اس کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا ہوا جو مولانا حالی کے نام کے حوالہ کی وجہ سے نہایت خوشدلی سے دیا گیا۔ اماں جان فرمایا کرتی تھیں کہ خواجہ صاحب مرحوم رقم کے انتظام کے سلسلہ میں ملک کے دورے کرتے تھے۔ بالخصوص اسلامی ریاستوں حیدر آباد دکن اور بھوپال وغیرہ کا اور ابا جان تعمیراتی امور کی نگرانی کرتے تھے۔ مرحوم خواجہ سجاد حسین میں اور ابا جان میں بہت قریبی تعلق تھا جو خواجہ صاحب کی وفات تک قائم رہا۔ سکول کے نصاب میں قرآن کی تعلیم اور اسلامیات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ جب خواجہ صاحب صوبہ سرحد کے انسپکٹر تعلیمات کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر مستقلاً" پانی پت میں آباد ہوگئے تو سکول کے معاملات کی نگرانی خود کرنے لگے اور قرآن کریم کی تعلیم کے علاوہ ترجمتہ القرآن کی کلاس جاری کی۔ صبح کو سکول کے تمام طلباء پہلے پیریڈ میں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ شہر کے متعدد حفاظ و قراء اس خدمت پر معقول مشاہرہ پر مامور تھے۔ طلباء اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف درجات میں منقسم تھے اور حفظ و ناظرہ کی تعلیم حسب استعداد حاصل کرتے تھے۔ جو طلباء حافظ یا ناظرہ قرآن پڑھے ہوتے تھے' انہیں ساتویں جماعت میں عربی بطور اختیاری مضمون لینے کی ترغیب دی جاتی تھی اور پھر انہیں ترجمتہ القرآن کی کلاس میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس کلاس میں شمولیت پر ایک قلیل سا وظیفہ بھی بطور ترغیب دیا جاتا تھا۔ جب تک خواجہ سجاد حسین مرحوم کے قوائے جسمانی نے ساتھ دیا وہ خود روزانہ تانگے پر سوار ہو کر تشریف لاتے تھے اور نہ صرف تعلیم قرآن کے تمام درجات کا خود معائنہ کرتے تھے بلکہ ترجمتہ القرآن کی کلاس میں شامل ہوتے تھے۔ اس کلاس کے استاد مولانا عبدالحلیم صاحب تھے۔ جب میں اس جماعت تک پہنچا تو خواجہ صاحب کا آنا بوجہ ضعف و نقاہت کے بند ہوچکا تھا۔ اس لیے ہم نے حضرت مولانا سے ترجمہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ بہت نرمی سے بلکہ نہایت شفقت و محبت کے ساتھ تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت تو کم عمری میں اس نعمت کی صحیح قدر نہ تھی' صرف ضابطہ کی کارروائی پوری کرتے تھے لیکن جب احساس پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت

مولانا نے کیسی عظیم نعمت سے ہمیں روشناس کرایا۔ افسوس میں ابھی نویں جماعت کے آخر یا دسویں کے شروع میں تھا کہ حضرت مولانا جوانی ہی میں ۱۹۴۶ء/ ۱۳۶۶ھ میں وفات پا گئے۔ دو کم سن بیٹیاں پیچھے چھوڑیں جو پاکستان آ گئی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ان کے دادا حضرت مولانا محدثؒ کی سوانح حیات "تذکرۂ رحمانیہ" ہے جو پاکستان میں شائع ہو چکی ہے۔ راقم الحروف صرف ایک بار مولانا کی تلاش میں ان کے مردانہ مکان میں داخل ہوا تھا' تو دیکھا کہ وہاں ایک نہایت اعلیٰ کتب خانہ دینی کتب کا ہے اور مولانا تفاسیر کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خدا ہی کو علم ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قتل و غارت گری میں اس بے نظیر کتب خانہ کا کیا حشر ہوا۔

مولانا اتنے بلند پایہ عالم نہ سہی' جیسے ان کے دادا حضرت مولانا محدثؒ تھے لیکن اپنی ذات میں بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے بعد ان جیسے بھی نہیں۔

قاری حافظ شیخ احسان اللہؒ

قاری صاحب موصوف کا سلسلہ نسب ستائیسویں پشت میں سلطان شمس الدین حاکم یمن کے اور پینتیس واسطوں سے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول سے جا ملتا ہے اور یہ وہ مبارک خاندان ہے جس میں نسلاً" بعد نسلٍ چار صحابی ہیں اور اس میں متعدد حضرات زیور علم اور انوار باطنی سے آراستہ تھے۔ حضرت عبداللہؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ کے صاحبزادے والی یمن تھے اور وہیں رہتے تھے۔ اور وہاں کی امارت و سلطنت ان کے خاندان میں کئی پشت تک رہی۔ شیخ کمال الدین یمنی نے اس کو چھوڑ کر سیستان میں رہائش اختیار کی۔ پھر شیخ علاء الدین قندھار آ گئے اور پھر ان کے اخلاف میں سے مولوی لطف اللہ وہاں سے لاہور چلے آئے۔ ان کے بیٹے مولوی الٰہی بخش نے کنج پورہ ضلع کرنال میں سکونت اختیار کی پھر ان کے پوتے مولوی حافظ عنایت اللہ نے پانی پت کو اپنا وطن بنا لیا۔

آپ کے دادا مولوی حافظ عنایت اللہ نواب صاحب ٹونک کے اتالیق اور استاد تھے۔ اس تعلق سے آپ کے والد ریاست میں مناصب جلیلہ اور اعتماد کے عہدوں پر فائز رہے۔ سو موصوف تہذیب و متانت' حلم و بردباری' جود و سخا وغیرہ اوصاف حسنہ میں اپنے نام (یعنی "احسان") کا صحیح پیکر اور اپنے جد امجد کا نمونہ تھے۔

شیخ صاحب ۸ر محرم ۱۲۷۶ھ مطابق ۷ر اگست ۱۸۵۹ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں والد ماجد اور تمام گھرانہ کے ساتھ حج کو گئے۔ خود فرماتے ہیں

"جہاز میں بسم اللہ ہوئی تھی"۔ واپسی کے بعد والدہ ماجدہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس وقت آپ پانچ برس کے تھے۔ اس مصیبت کی وجہ سے والد ماجد نے آپ کو اپنے پاس ٹونک میں رکھ کر تربیت کرنا شروع کیا۔ ۱۸۷۲ء ۱۲۸۹ھ میں والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ابھی آپ پورے چودہ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ جوانی کی آمد آمد تھی' دولت دنیا سے گھر بھرا ہوا تھا۔ اس عمر میں مربیوں کے ہوتے ہوئے بہت سے نوجوان بھٹک جاتے ہیں اور جن کا کوئی مربی نہ ہو ان کا راہ راست پر رہنا بہت مشکل ہے۔ مگر طبیعت کی سلامت روی اور عنایت الٰہی سے رہبری ہوئی اور آپ نے حصول علم کے سوا دوسری طرف رخ بھی نہیں کیا۔ ۱۸۷۳ء ۱۲۹۰ھ میں پہلی شادی ہوگئی لیکن ان کی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۰ اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی فتح محمد اور مولوی گل حسن شاہ سے فارسی عربی پڑھی۔ حافظ غلام محمد خوشنویس سے لکھنا سیکھا اور حضرت شیخ الشیوخ قاری نجیب اللہ پانی پتی سے سبقاً سبقاً قرآن پڑھ کر فضیلت کا رتبہ حاصل کیا۔ اس کے ماسوا فنون سپہ گری' پٹہ اور بنوٹ وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا سید غوث علی شاہ قادریؒ سے شرف بیعت حاصل تھا۔ اپنے کمالات کو چھپاتے تھے۔ پہلا حج والدین کے تتبع میں کیا تھا' دوسرا حج صاحبزادے کی سیادت میں کیا۔ اوصاف حسنہ' ملنساری' محبت' انکسار' تواضع اور پابندی وضع میں بزرگوں کا نمونہ اور اپنے آباؤ اجداد کے جانشین تھے۔ احقر کے حال پر خاص توجہ رکھتے تھے۔

قاری سید قیام الدینؒ

آپ سید سعید الدین کے چھوٹے فرزند' قاری سید فخر الدین کے چھوٹے بھائی اور میرے شیخؒ کے نامور شاگرد تھے۔ ۱۸۶۳ء ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ملانی سعید النساء مرحومہ دختر قاری ممتاز علی صاحب سے چند سپارے پڑھے اور حافظ پیر بخش کے مکتب میں پورا قرآن ختم کیا۔ ابتدائی درسیات سے فارغ ہو کر ۱۸۹۲ء ۱۰۔ ۱۳۰۹ھ میں میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے سبعہ قرأت اور تجوید حاصل کیں۔ قاری صاحبؒ نے اس سند میں جو آپ کو عطا کی لکھایا "احقر سے حافظ قیام الدین نے مِنْ اَوَّلِہٖ اِلٰی اٰخِرِہٖ سبعہ قرأت جمعاً" اور افراداً" پڑھیں اور بعض روایات مثل روایت قالون تمام و کمال سنائیں"۔ آخر میں فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ حافظ قیام الدین کو راہ ہدایت پر قائم رکھے اور قرأت کی خدمت میں استقامت عطا فرمائے۔ میں ان کو اجازت دیتا ہوں کہ جس کو سبعہ پڑھنے کا اہل دیکھیں اسے سبعہ پڑھائیں اور جو سند کا اہل ہو اسے سند دیں۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور عمر طبعی کو پہنچائے۔ آمین ثم آمین"۔

آپ نے شیخ الشیوخ قاری نجیب اللہ اور شیخ المشائخ مولانا قاری عبدالرحمٰن محدثؒ سے اگرچہ پڑھا نہیں مگر دونوں بزرگوں اور پانی پت کے دیگر شیوخ سے سماعاً" استفادہ کرتے رہے۔ تجوید اور قرأت کی واقفیت فاضلانہ تھی۔ رات دن خدمت قرآن میں لگے رہتے تھے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ کے حصہ تعلیم قرآن کے صدر المشائخ تھے

اور آپ کے وجود کی بدولت وہ آپ کی زندگی میں قرآن کی بہترین درسگاہ تھی۔ بکثرت طلباء نے آپ سے پڑھا۔ ۱۹۰۹ء ر ۱۳۲۷ھ تک رمضان المبارک میں قرآن سنایا کرتے تھے۔ اُس کے بعد کچھ انکسار کا اور کچھ وہم کا ایسا غلبہ ہوا کہ سنانا چھوڑ دیا۔ عرصہ تک احقر کا سنتے رہے۔ چنانچہ جب میں نے پہلی مرتبہ روایات پڑھنا شروع کیں تو ورش' بزی' قنبل' دوری' سوسی' ہشام اور ابن ذکوان کی روایات میں مجھے آپ کی یادداشت سے بڑی مدد ملی۔ بلکہ میں نے بعض روایات بغیر تیاری کے آپ کے اعتماد پر سنائیں۔ اس کے بعد یکلخت کنارہ کش ہوگئے۔ اس کے بعد سالہا سال تک صرف معصوموں کا (یعنی کم عمر طلباء کا) سنتے رہے۔

بہ ملازمان سلطاں کہ رساند ایں دعا را
کہ بہ شکر پادشاہی ز نظر مران گدا را

(خادمان سلطان تک کوئی یہ التجا پہنچا دے کہ شاہی احسان کرم کے طفیل اس فقیر کو بھی نظروں سے نہ گرایئے)

افسوس صد افسوس کہ ہفتہ ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۴ر فروری ۱۹۳۰ء کو کاربنکل کے زخم کے صدمہ سے ۹ بجے صبح قضا کی۔

[ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ مؤلفؒ کو قاری سید قیام الدینؒ سے خصوصی تعلق تھا۔ ان کو مثل اپنے بڑے بھائی اور بزرگ کے سمجھتے تھے۔ سید صاحب موصوف ان سے تقریباً ۱۵ سال عمر میں بڑے تھے۔ وہ ابا جان کے تصنیفی کام کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم محرک تھے۔ "شرح سبعہ قرأت" کی تصنیف و تکمیل میں ان کا بڑا حصہ ہے' خود ابا جان لکھتے ہیں۔ "کثرت مشاغل کی وجہ سے کام کی رفتار بے حد سست تھی مگر سعدی ہند مولانا حافظ قاری خواجہ حالیؒ' حکیم الامت مولانا حافظ قاری اشرف علی تھانوی مدظلہ اور میرے محترم استاد بھائی حافظ قاری محمد قیام الدین ہاشمی عم فیضہٗ کے ارشادات تازیانہ کا کام کرتے رہے"۔

اسی طرح "شجرۂ سبعہ قرأت" جیسی گراں بہا تصنیف کی اشاعت میں بھی سید

صاحب کی تحریک کو فیصلہ کن دخل حاصل تھا۔ حضرت مؤلفؒ لکھتے ہیں۔ "بعض وجوہات کی بنا پر میرا ارادہ اس کی اشاعت کا نہ تھا' مگر اپنے استاد بھائی اخی مکرم' برادر محترم قاری حافظ محمد قیام الدین ہاشمی قریشی پانی پتی..... کے اصرار و تا قلین کے تصرف کے خوف سے شائع کرتا ہوں۔۔۔ اس کی اشاعت کے مصارف کا ایک حصہ بھی برادر ممدوح نے ادا کیا ہے"۔ "شجرۂ سبعہ قرأت" رمضان ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوئی اور ٹھیک ایک سال بعد سید صاحب وفات پاگئے۔]

آپ کی خواہر محترمہ بی بی اکبری بیگم عین ابتدائے شباب میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بھی میرے شیخ سے سبعہ قرأت پڑھیں اور تمام عمر خدمت قرآن میں صرف کی۔ اکثر طالبات اور بعض بچوں نے ان سے قرآن پڑھا۔ آخر تک یہی شغل تھا۔ اکثر روزہ رکھتیں اور تعلیم قرآن سے جو وقت بچتا اس کو اوراد و وظائف اور مخلوق الٰہی کی خدمت میں صرف کرتیں۔ ذہانت و طباعی' اختراع و ایجاد اور دست کاری میں کوئی نظیر نہ تھا۔ تہذیب و متانت کے ساتھ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا خاص ملکہ تھا۔ شوال ۱۳۳۷ھ یعنی جولائی ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔

قاضی قاری صدر الدین انصاری بن قاضی شرف الدینؒ

۱۸۸۲ء ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ صغرسنی میں والد نے قضا کی۔ نیک دل والدہ نے بڑی جانکاہی اور محبت سے پرورش کیا اور اپنی تمام جوانی ان کی نگہداشت اور تربیت پر صرف کر دی۔ مولوی عبدالرحمٰن عرف مولوی ڈبل[1] سے "سبقا" "سبقا" قرآن پڑھا۔ قاضی صاحب اردو' فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی شاخ انصار میں مدرس مقرر ہوگئے۔ اس دوران میں قرآن کی تجوید کا شوق پیدا ہوا اور میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے دس برس تک مشق کی اور پے در پے سنایا۔

حضرت ممدوح اس زمانے میں زیادہ تر باہر رہتے تھے اور گاہ بگاہ پانی پت آتے تھے۔ جتنا عرصہ یہاں قیام رہتا قاضی صاحب استفادہ کرتے رہتے اور تقریباً ہر وقت حاضر خدمت رہتے۔ تجوید' حدر (تیز مگر درست پڑھنا) اور ادا میں اجتہاد کا درجہ حاصل کرلیا اور حضرت شیخ کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے ہیں۔

ا (مولوی صاحب مرحوم کا اپنے موٹاپے اور خوش خوری بلکہ بسیار خوری کی وجہ سے یہ عرف پڑ گیا تھا۔ پھر اسی عرف سے پہچانے جاتے تھے۔ انگریزی کے اس لفظ کے استعمال سے ہم عصروں کی بذلہ سنجی اور لطافت کی حس ظاہر ہوتی ہے۔ غالباً یہ لفظ "ڈبل روٹی" سے مستعار لیا گیا ہے اور اسی کی مناسبت سے تشبیہ کی لطافت بھی ظاہر ہوتی ہے)

جسم کمزور اور قویٰ ضعیف ہیں۔ اسی کے مطابق آواز بھی پست ہے۔ یہ قدرتی باتیں ہیں' ان کو کسب سے کوئی شخص پیدا نہیں کر سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ خدا نے جو نعمتیں دے رکھی ہیں ان سے جسم کی پرداخت میں مدد نہیں لی جاتی۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ میں نے حضرت قاضی صاحبؒ کو ان کی ضعیفی میں دیکھا۔ اس وقت وہ حال مسلم ہائی سکول میں قرآن شریف پڑھانے پر مامور تھے۔ باقی وقت گھر پر گزارتے تھے اور صرف بہت محدود تعداد میں ایسے شاگردوں کو قرآن و تجوید سکھاتے تھے جن سے کوئی خصوصی خاندانی تعلق ہو یا جن کے شوق اور صلاحیت سے متاثر ہو جائیں۔ ہمارے گھر میں جو شبینہ ہوا کرتا تھا اس میں آخر شب میں غالباً نصف سپارہ تلاوت فرماتے تھے۔ ابا جان خصوصیت سے ان کی تلاوت سنا کرتے تھے۔ جب قاضی صاحب پڑھنا شروع کرتے تھے تو آواز اتنی پست ہوتی تھی کہ خود ان کے سوا کوئی ان کی تلاوت سن نہیں سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ آواز کھلنے لگتی تھی تو پھر ایک سحر سا قائم ہو جاتا تھا۔ سب سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ نہایت شیریں آواز تھی اور حرکات و مخارج کا تو بیان ہی کیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ابا جان نیت باندھ پیچھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس وقت سامعین سمجھ جاتے تھے کہ کوئی فنی غلطی ہو گئی ہے جو ہماری فہم سے ماورا ہے۔ سو وہ قاضی صاحب کو پیچھے سے لوٹواتے۔ قاضی صاحب ان کی آواز فوراً پہچان جاتے اور لوٹا کر وہاں سے پڑھتے جہاں سے بتایا جاتا' پھر کبھی تو وہ خود اپنی غلطی کی اصلاح کر لیتے کبھی ابا جان اصلاح کراتے لیکن ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوا کہ کیا "غلطی" تھی۔

قاضی صاحب کا کنبہ انتہائی مختصر تھا۔ ایک وہ' ایک ان کی بیگم اور ایک صاحبزادے جو آرمی ایجوکیشن کور میں ملازم تھے اور غالباً کپتان تھے۔ چونکہ وہ اپنی ملازمت پر رہتے تھے اور صرف کبھی کبھار پانی پت سے آتے تھے اس لیے میاں بیوی تنہا اپنے بڑے سارے گھر میں رہتے تھے۔ مشہور تھا کہ دونوں میاں بیوی نے ساری زندگی ایک دوسرے سے براہ راست کلام نہیں کیا۔ بوجہ حجاب اور شرم کے اور پھر

ایسی عادت چھوٹی کہ لطیفہ بن گئے۔ اگر بیوی کو کوئی کام کرانا ہوتا تو وہ مردانہ کے دروازے کے قریب آ کر دھیمی آواز میں دروازہ سے مخاطب ہو کر کہتی "میاں دروازے' گوشت سبزی چاہیے" اور ٹوکری یا رومال رکھ کر چلی جاتیں۔ قاضی صاحب خود یا کسی شاگرد کے ذریعے مطلوبہ اشیاء منگا کر کھڑکی کا پٹ کھٹکھٹا دیتے اور آہستہ سے کہتے "بی کھڑکی' سودا آگیا ہے"۔ یہ محض لطیفہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ اور حضرت کے جو شاگرد پاکستان میں رہتے ہیں اس کے گواہ ہیں۔ مجھ سے اس کی تصدیق محترم ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے کی جو ان دنوں قاضی صاحب سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔

قرآن میں حرف "ض" بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اس کا تلفظ کچھ "ز" اور "ز" کے قریب ہے۔ جیسے "ضعیف آدمی" یہی تلفظ بہت سے پڑھنے والے قرآن میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ آج کل اہل عرب اسے "د" کی طرح پڑھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں بھی اکثر پڑھنے والے قرآن میں اسی مخرج کو ادا کرتے ہیں لیکن اہل پانی پت اس کا تلفظ ایسے مخرج سے حلق کی گہرائی سے کرتے تھے جو گویا "غ" کی آواز کو غلیظ یا گاڑھا کرنے سے بنتا تھا۔ یہ ایک ایسی تکنیکی بات ہے کہ میں جس کا عملی مظاہرہ تو کر سکتا ہوں لیکن اسے الفاظ میں بیاں کرنا نہایت مشکل ہے۔ اہل پانی پت کا دعویٰ تھا کہ ہمارے مخارج قرآن بالکل وہی ہیں جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے اصحابؓ کو تعلیم کیے اور آپ سے نقل در نقل پورے ضبط و امانت کے ساتھ ہم تک پہنچے۔ حضرت اباجان نے جو "شجرۂ سبعہ قرأت" تصنیف فرمایا تھا اس میں ہر روایت کا شجرہ اپنی ذات سے لے کر اپنے شیوخ کے ذریعہ کڑی در کڑی اور نسل در نسل حضرت رسالت مابؐ تک پہنچایا ہے اور ساتھ ضروری تفاصیل درج کی ہیں۔ یہ اگرچہ صرف بتیس صفحات کا رسالہ ہے لیکن اس مضمون پر ایک بے بدل تصنیف ہے۔

بہرحال حضرت قاضی صاحب پانی پت والوں کے برخلاف عام طلبہ کو "ض" بمخرجِ "د" مثل اہلِ عرب کے پڑھاتے تھے۔ صرف مخصوص شاگردوں کو' جنہیں تجوید کا اہل سمجھتے تھے' صحیح مخرج کی تعلیم کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا مسلک یہ

تھا کہ "ض" کا صحیح تلفظ انتہائے مشق و احتیاط سے آتا ہے۔ عام پڑھنے والا اسے "غ" بنا دیتا ہے جو بالکل غلط ہے اور اس سے بہتر ہے کہ "د" سے قریب جو مخرج ہے وہ سکھا دیا جائے۔ اس میں غلطی کا احتمال کم ہے۔

حضرت قاضی صاحب کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ روایت مشہور تھی کہ انہوں نے اپنے "ض" کے مخرج کی اصلاح کیسے کی۔ حضرت مولانا محدث انصاریؒ کے مزار مبارک پر ایک کنواں تھا۔ اس کی گہرائی اور اس کی دیواروں کی گولائی میں قدرتاً کچھ ایسی مناسبت بن گئی تھی کہ اس کی من پر بیٹھ کر منہ جھکا کر جو آواز نکالی جائے وہ صاف واپس آتی تھی۔ ہم لوگ لڑکپن میں صرف یہ کھیل کھیلنے اس مزار پر جایا کرتے تھے۔ ایک شب عشاء کی نماز کے بعد حضرت قاضی صاحب اس کنوئیں کی من پر بیٹھ گئے اور سورۂ فاتحہ کی آخری آیت **غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ** کی مشق شروع کر دی۔ پہلے یہ مخارج ادا کرتے تھے' پھر ان کی باز گشت سنتے تھے' پھر اپنی اصلاح کرتے تھے' پھر سنتے تھے۔ تمام رات اس قبرستان کے وحشت ناک ویرانے میں اپنے گرد و پیش سے غافل اسی مشق میں لگے رہے' یہاں تک کہ خود اپنا اطمینان ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء میں گھربار کے اجڑ جانے کا اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ ذہنی توازن میں فرق آگیا۔ سوئے نصیب سے چند برسوں کے بعد جوان بیٹا بھی سامنے ہی فوت ہوگیا' اس کے بعد حواس بالکل ہی مختل ہوگئے اور اسی عالم میں بہاولپور میں انتقال کیا۔

مولوی قاری عبدالسلام عباسی مولوی فاضل

مولانا موصوف قاری احمدی کی نواسی کے فرزند اور پوت داماد (یعنی پوتی کے شوہر) تھے۔ (۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء) میں پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا محدثؒ نے نام رکھا۔ قاری عبداللہ سے قرآن پڑھا اور فارسی پڑھنے کے بعد مولوی راغب اللہ صاحب سے علوم رسمیہ کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے امتحان مولوی فاضل پاس کیا۔ عرصہ تک سرکاری مدرسہ میں عربی کے استاد رہے۔ قصبہ کے خوش حال اور باحیثیت مسلمانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ذہانت' طباعی' ادبی قابلیت' لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ شاعری سے بھی خاص مناسبت تھی۔ ۱۰-۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء میں حضرت مولانا محدثؒ سے سبعہ قرأت سماعاً" حاصل کیں اور شاطبیہ پڑھی۔ شاطبیہ اکثر پڑھاتے رہتے تھے لیکن سبعہ قرأت کی جانب ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء تک کوئی توجہ نہ تھی۔ اس وقت سے سبعہ قرأت پڑھاتے رہے۔ اوسط درجہ کی واقفیت رکھتے تھے۔ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ایک عرصہ وکالت کرتے رہے۔ پھر آنریری مجسٹریٹ ہوگئے۔ یک شنبہ' ۲۳/ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۹۲۸ء کی صبح آٹھ بجے انتقال کیا۔

حافظ قاری محمد یحییٰ عثمانیؒ

آپ احقر کے چچا زاد بھائی اور حافظ محمد یعقوب کے فرزند تھے۔ ۱۸۶۵ء ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن حافظ پیر بخش کے مکتب میں یاد کیا مگر سبق اپنے والد ماجد سے پڑھا کرتے تھے اور حافظ ہونے کے بعد موصوف کو پے در پے سنایا۔ ۱۸۸۹ء ۱۳۰۷ھ میں میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے سبعہ قرأت پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ تمام روایات ضبط تھیں۔ رمضان المبارک میں ایک ایک کر کے تمام روایات سنائیں۔ سیدھی سادی وضع کو پسند کرتے تھے۔ عمر بھر قرآن شریف کی خدمت میں مصروف رہے۔ بکثرت طلباء نے آپ سے استفادہ کیا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو فارغ البالی عطا فرما کر حصول رزق کی کشمکش سے آزاد رکھا تھا۔

احقر ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ میں نے ہوش سنبھالا تو حافظ قاری محمد یحییٰ اور ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد ابراہیم' جن کا ذکر آگے آتا ہے' دونوں حیات تھے۔ حافظ یحییٰ کو ہم بڑے تائے ابا اور حافظ ابراہیم کو چھوٹے تائے ابا کہا کرتے تھے۔ بڑے تائے ابا کی عمر پچھتر چھہتر سال ہوگی' نہایت سادہ طبیعت' نیک طینت' صاف باطن اور بھولے بھالے بزرگ تھے۔ دنیاداری کے طریقوں سے بالکل نا آشنا' جس طرح خود سچی اور سادہ طبیعت کے مالک تھے اسی طرح ہر شخص کو سمجھتے تھے۔ کسی کے بارہ میں جھوٹ' تصنع یا فریب کا گمان بھی ان کے پاس سے نہ ہو کر گزرتا تھا۔ وہ غالباً

ان الفاظ کے مفہوم ہی سے نا آشنا تھے۔ جو سادگی ان کے مزاج میں تھی وہی ان کے لباس' خوراک اور نشست و برخواست میں تھی۔ گرمی سردی گاڑھے یا لٹھے کا کُرتا پاجامہ پہنتے۔ سردی میں گاڑھے کی واسکٹ یا "مرزائی" کا اضافہ فرما لیتے۔ شدید سردی میں روئی بھری واسکٹ بھی پہنے دیکھا ہے۔ پانی پت میں واسکٹ کے لیے "صدری" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ غالباً اس لیے کہ اسے "صدر" یعنی سینہ کو سردی سے بچانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ معقول زمینداری تھی جس سے ان کے کنبہ کے اخراجات کے لیے وافر آمدنی آ جاتی تھی--- ان کا اپنا ذاتی خرچ تو میرے خیال میں نہ ہونے کے برابر ہی ہوگا۔ لیکن شغل کے طور پر لکڑی کا کاروبار کرتے تھے' جہاں سوختنی لکڑی بھی بکتی تھی اور عمارتی بھی۔ سارا دن وہاں گزارتے تھے اور طلباء کو قرآن پڑھاتے رہتے تھے۔ بقر عید کے گزرتے ہی چند بکری کے بچے خرید کر اپنی ٹال پر چھوڑ دیتے تھے اور نہایت محبت سے اگلی بقر عید تک ان کی پرورش کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں سے اور اپنے بکروں سے ایک جیسی محبت کرتے تھے--- یعنی اپنے بچوں کی طرح۔ اگر بکرے ان کی اپنی ضرورت سے فالتو ہوں اور کوئی خریدنا چاہے تو غالباً فروخت کر دیا کرتے تھے۔ ان کے کاروبار کے سلسلہ میں دو لطیفے خاندان میں مشہور تھے جن سے ان کی سادگی اور بھولپن پر روشنی پڑتی ہے۔

سنا ہے ان کی ٹال پر ایک نہایت اعلیٰ ساگوان کا شہتیر آ گیا۔ ایک گاہک نے قیمت پوچھی' آپ نے ڈیڑھ سو روپیہ بتائی۔ وہ سو روپے سے شروع ہوا اور ایک سو بیس پر آ کر رک گیا۔ تائے ابا ایک سو تیس تک اترے اور اڑ گئے' لہٰذا سودا نہ ہوسکا۔ چند روز بعد ایک اور گاہک آ گیا۔ آپ نے اس سے بھی وہی قیمت طلب کی' وہ بھلا آدمی اسی روپے سے شروع ہوا اور سو روپے پر آ کر اڑ گیا۔ حافظ جی بہت حیران ہوئے' بولے بھائی پرسوں ہی ایک گاہک ایک سو بیس میں لے جا رہا تھا۔ بھلا میں سو روپیہ کیوں دے دوں۔ چلو تم ایک سو بیس میں لے جاؤ۔ وہ گاہک بھی چلا گیا۔ اس کے بعد جو خریدار آیا وہ ساٹھ روپے سے شروع ہو کر اسی روپے پر رک گیا۔

اس کے بعد جو خریدار آیا وہ ساٹھ روپے سے شروع ہو کر اسی روپے پر رک گیا۔ تائے ابا اسے سو روپیہ میں دینے پر راضی ہوگئے لیکن وہ نہ مانا۔ اگلے روز تھانیدار آیا' بولا حافظ جی سنا ہے آپ کے پاس ایک شہتیر بڑا عمدہ آیا ہے۔ تحصیلدار کو اپنے مکان کی چھت کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ میں لے جا رہا ہوں' قیمت آپ کو ساٹھ روپے مل جائے گی۔ تائے ابا بے بسی سے دیکھتے رہے اور تحصیلدار صاحب کے گرگے ان کا قیمتی شہتیر گاڑی پر لاد کر لے گئے۔ پھر اس قسم کے استحصالی عمال سے کسے قیمت ملی ہے جو تائے ابا کو ملتی!

اسی طرح کا سانحہ ان کے ایک بکرے کے ساتھ ہوا' جسے انہوں نے بڑے پیار سے اپنے ہاتھ سے دودھ پلا کر اور دانے کھلا کر پالا تھا۔ وہ انسان کے بچوں کی طرح ان سے مانوس ہوگیا تھا اور سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی طرح وہ تائی اماں سے بے تکلف تھا۔ ان کے پاندان میں بھی منہ مار دیتا تھا اور روٹی کی چنگیر میں بھی۔گھر کی چھتوں اور منڈیروں پر کلیلیں کرتا پھرتا تھا۔ بقر عید سے کچھ پہلے اس کا ایک گاہک آ گیا لیکن حافظ جی اس کی لگائی ہوئی قیمت پر دینے کو راضی نہ ہوئے۔ دوسرے گاہک نے جب پہلے سے بھی کم قیمت لگائی تو بھولے تائے ابا اسے پہلے خریدار کی قیمت پر دینے کو راضی ہوگئے۔ شہتیر کی طرح اس بار بھی یہی سلسلہ چلا اور ایک روز اطلاع ملی کہ تائے ابا کا لاڈوں سے پالا ہوا بکرا اپنی شوخ حرکات کے سبب دوسری منزل کی منڈیر سے گر کر لنگڑا ہوگیا۔ چنانچہ تائی اماں نے اسے ذبح کرا کے عزیزوں کی دعوت کی اور نہایت نفیس پلاؤ قورمہ سب نے کھایا۔ تائے ابا اس بے زبان کے زخمی ہونے سے اس قدر دل گیر تھے' جیسے شاید اپنے اکلوتے بیٹے کے بیمار ہونے سے ہوتے تھے۔ بار بار اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو پیار کرتے تھے اور روتے تھے۔

دونوں میاں بیوی کے طبائع میں بعد مشرقین تھا۔ تائی اماں نہایت نفیس مزاج تھیں' اعلیٰ سے اعلیٰ پہنتی تھیں اور پر تکلف کھانے پکواتی تھیں۔ دو ہی اولادیں تھیں: ایک لڑکا' ایک لڑکی اور وہ دونوں اپنی ماں کے مزاج پر گئے تھے۔ تائے ابا کے مزاج سے دونوں کو مناسبت نہ تھی۔

تائے ابا قرآن پڑھانے کا معاوضہ کسی شکل میں بھی قبول نہ کرتے تھے۔ اس معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ والدین اپنے بچوں کے داخلہ کے وقت یا دوران تعلیم یا ختم قرآن کی خوشی میں کوئی تحفے تحائف لاتے تھے تو ان کو ہاتھ لگانے کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ اگر مٹھائی ہوتی تھی تو فرماتے تھے اپنے ہاتھ سے طلباء میں تقسیم کر دو۔ اگر کپڑے یا نقدی ہوتی تھی تو کسی حاجت مند کا پتہ بتا دیتے تھے کہ وہاں لے جاؤ۔ خانہ خدا سے عشق تھا چنانچہ گھر سے ملحق مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے۔ ان کے کئی مکانات تھے' جدی مکان بہت وسیع اور حویلی نما تھا۔ بڑا ہونے کے ناطے ان کے حصہ میں وہی لگا تھا لیکن اپنی ایثار پسند طبیعت کے سبب وہ اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد ابراہیم کے تصرف میں دیا ہوا تھا۔ اپنے کنبہ کو ایک نسبتاً چھوٹے مکان میں رکھا ہوا تھا' خود نہ بھائی کے ساتھ رہتے تھے نہ بیوی بچوں کے۔ قرآن کی تعلیم سے جو وقت بچتا تھا مسجد ہی میں گزارتے تھے۔ میری بڑی بہن حافظ محمد ابراہیم کی بہو تھیں۔ انہیں تائے یحییٰ سے بہت پیار تھا۔ وہ بہت اصرار کرتی تھیں کہ تائے ابا آپ میرے پاس رہا کریں' یہ گھر تو مسجد سے بالکل ملحق ہے لیکن وہ عذر کرتے تھے کہ بیٹے مجھے سانس پھولنے کا عارضہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں گھر سے چلوں اور سانس پھول جانے سے میری جماعت کی نماز فوت ہو جائے۔ آخر مسجد ہی میں وفات پائی۔ یہ ذیقعد ۱۳۶۰ھ (نومبر ۱۹۴۱ء) کا واقعہ ہے۔ صبح کو تہجد کے وقت حجرہ سے باہر آئے۔ کئی ایک رفقاء تہجد کے وقت مسجد آیا کرتے تھے۔ ان سے علیک سلیک کی۔ جو ساتھی نہیں تھے ان کا احوال پوچھا اور واپس حجرہ میں چلے گئے۔ فجر کے وقت باہر نہ نکلے تو لوگ پریشان ہوئے' دروازہ کھٹکھٹایا' آوازیں دیں لیکن جواب نہ ملا۔ ادھر نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ فیصلہ ہوا' جماعت کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو دروازہ توڑ کر اندر جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا' دیکھا کہ انتقال ہو چکا ہے' بستر پر سیدھے لیٹے ہیں اور سینے پر ہاتھ اس طرح بندھے ہیں جیسے نماز کی نیت کی ہوئی ہو۔ سبحان اللہ۔ کیا زندگی تھی اور کیسی پاکیزہ موت ہوئی۔ تقریباً ایسی ہی موت ان کے دادا حافظ شمس الاسلام کی ہوئی تھی'

جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بڑے بلند پایہ تابعی تھے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دیکھا ہے۔ ہمیں بتلایئے وہ کیسے ہوتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ تم اگر انہیں دیکھو تو دیوانہ کہو اور وہ تمہیں دیکھیں تو کافر سمجھیں۔

میں آج کے ماحول سے جب بڑے تائے ابا مرحوم اور ان کے ہم عصر بزرگوں کا موازنہ کرتا ہوں تو ہوبہو یہی صورت نظر آتی ہے کہ وہ اگر آج ہمارے درمیان آجائیں تو ہم انہیں دیوانہ کہیں گے اور وہ ہمیں دیکھیں تو ہرگز نہ مانیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ سچ ہے مسلمانی در کتاب و مسلماں در گور۔

حافظ قاری محمد ابراہیم عثمانیؒ

موصوف حافظ قاری محمد یحییٰ مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالرحمٰن عرف مولوی ڈبل سے قرآن پڑھا اور اپنے والد کو پے در پے سنایا۔ قاری سید قیام الدین کے ساتھ میرے شیخؒ سے سبعہ قرأت پڑھنا شروع کیں مگر تکمیل نہ کر سکے۔ قرآن پڑھنے کا لہجہ اور طریقہ ادا نہایت دلپذیر و پاکیزہ اور معاصرین سے ممتاز تھا۔ قرآن سنانے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ عرصہ تک درگاہ حضرت قلندر صاحبؒ (سے ملحق مسجد) میں رمضان المبارک کی پہلی سات شبوں میں ایک منزل فی شب کے حساب سے ایک ختم سنانے کا معمول رہا۔ پانی پت کے بہترین حفاظ میں شمار ہوتے تھے۔

ایم۔ اے۔ عثمانی عرض کرتا ہے کہ حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ کا عرس غالباً رمضان المبارک نویں شب سے شروع ہوتا تھا اور تین چار روز جاری رہتا تھا۔ اس دوران درگاہ میں زائرین کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ گرد و پیش بازار لگ جاتے تھے۔ سماع خانے میں قوالی کی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا' اس لیے درگاہ سے ملحق مسجد میں دستور تھا کہ تراویح میں ایک قرآن شریف سات شبوں میں ختم کیا جائے۔ گویا ہر شب بیس تراویح کی نماز میں تقریباً سوا چار سپارے اوسطاً" پڑھے جاتے تھے۔ یہ نہ صرف مقتدیوں کے شوق اور ہمّت کا امتحان تھا بلکہ اس کے لیے بڑے جید حافظ کی ضرورت تھی جو صاف اور تیزی سے پڑھ سکتا ہو۔ حافظ محمد ابراہیم جو اپنے بڑے بھائی

حافظ قاری محمد یحییٰ سے دس سال چھوٹے اور ابا جان سے تین سال بڑے تھے اور جنہیں ہم چھوٹے تائے ابا کہتے تھے' ایک عرصہ سے قلندر صاحب میں محراب سنا رہے تھے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو کافی ضعیف ہوچکے تھے۔ دمہ کے مریض تھے۔ سانس مشکل سے نکلتا تھا' چند قدم چلنا دشوار تھا۔ ہر سال اپنے مقتدیوں سے معذرت کر لیتے تھے کہ بھئی اب میری صحت جواب دے گئی۔ کسی اور حافظ کا انتظام کر لینا لیکن شعبان میں نمازیوں کا ایک وفد آ کر بضد ہو جاتا تھا تو آپ پھر کمر ہمت باندھ لیتے تھے۔ کئی بار ہم اپنی محراب سنا کر تائے ابا کا قرآن سننے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ مسجد کے باہر تک بالکل صاف آواز سنائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کوئی بارہ سال کی عمر کا بچہ پڑھ رہا ہے' نہایت شیریں آواز تھی۔ قرآن پڑھنے میں سانس بھی نہ پھولتا تھا۔ اس وقت ستر اکہتر برس کے تھے۔ رمضان کے روزے باقاعدہ رکھتے تھے' باوجود بیماری کے کبھی روزہ قضا نہیں کیا۔ یہ لوگ "رخصت" کے نہیں "عزیمت" کے قائل تھے۔ یعنی جہاں کسی عذر شرعی کی وجہ سے کسی عمل کے ترک کرنے کی اجازت بھی ہو وہاں محض اپنے عزم و ہمت اور قوت ایمانی کی وجہ سے اس عمل کو نبھاتے تھے' ترک نہ کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۶ء کے رمضان سے تائے ابا نے قرآن سنانا چھوڑا اور ان کی جگہ ایک اور جید حافظ چودھری حبیب اللہ صاحب نے' جو عرف عام میں "حافظ بلّہ" کہلاتے تھے' سنانا شروع کیا۔ میں نے انہیں کچھ عرصہ منزل سنائی تھی۔ پانی پت میں اپنی صحت تلاوت کے لیے مشہور تھے۔ جن حفاظ کو قرآن صحیح طور پر یاد نہ ہوتا تھا۔ "حافظ بلّہ" کو منزل سناتے تھے۔ انہیں یاد کرانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ میں صرف پندرہ سپارے ان کے ساتھ تیار کر سکا تھا لیکن وہ آئینہ کی طرح ہوگئے تھے۔

تائے ابراہیم کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ نہایت دبلے پتلے تھے' بالکل تاڑ کے درخت کی طرح۔ ضعیفی میں کمر کافی جھک گئی تھی لیکن پھر بھی مجھ سے اونچے تھے۔ جوانی میں پہلوانی اور کبوتر بازی کا شوق کیا۔ خود اپنے ایک مکان میں اکھاڑہ بنوایا تھا۔ ان کے استاد دلی کے ایک پہلوان تھے جو عرف عام میں نواب پہلوان کہلاتے

تھے۔ پانی پت آ کر حضرت مولانا سید غوث علی شاہؒ صاحب کے مرید ہوگئے اور پھر یہیں بس رہے۔ تائے ابا سے کیسے تعارف ہوا' یہ تو نہیں معلوم لیکن مستقلاً" اس اکھاڑہ والے مکان میں رہتے تھے اور ان کی وجہ سے وہ نواب پہلوان کا اکھاڑہ کہلانے لگا۔ مشہور تھا کہ ان کے پاس اپنے مرشد کا دیا ہوا ایک تعویذ ہے' جس کی برکت سے انہوں نے کبھی شکست نہیں کھائی۔ تائے ابا ان کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کرتے تھے۔ بڑے عابد و زاہد اور شب زندہ دار آدمی تھے۔ قلندر صاحب کی درگاہ سے ملحق جس حجرہ میں مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ نے وظائف و معمولات کیے تھے' اسی میں نواب پہلوان بھی اوراد و عبادات کرتے رہے۔ بعد میں مقابلہ کی کشتیاں لڑنا چھوڑ دی تھیں البتہ اپنے شاگردوں کو ضرور مقابلوں میں بھیجتے تھے اور جو وقت اپنی عبادت سے بچتا تھا وہ ان کی تربیت پر صرف کرتے تھے۔ تائے ابا سے خصوصی انس تھا۔ انہیں پہلوانی کے علاوہ باطنی علوم و اعمال کی تعلیم بھی دی تھی۔ تائے ابا کی پہلوانی تو گویا رئیسی شوق تھا' کبھی کسی مقابلہ کی کشتی میں نہیں گئے لیکن ایک دو واقعات ان کی پہلوانی کے مشہور تھے۔ کہتے ہیں ایک انگریز پہلوان پانی پت آ گیا۔ اس نے نواب پہلوان کی شہرت سن رکھی تھی اور ان سے مقابلہ کا خواہش مند تھا۔ پوچھتا پوچھتا ان کے اکھاڑہ میں پہنچ گیا۔ نواب صاحب اس وقت اپنے وظائف میں مصروف تھے۔ شاگردوں کو اشارہ سے کہہ دیا کہ میرے بارے میں نہ بتانا۔ سو انہوں نے کہہ دیا' نواب پہلوان یہاں نہیں ہیں۔ وہ انتظار میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں تائے ابا آ گئے۔ اس نے پوچھا تم نواب پہلوان ہو۔ استاد نے اشارہ کیا تو تائے ابا نے کہا: ہاں' میں ہی نواب پہلوان ہوں۔ بولا تم سے کشتی لڑنے' بہت دور سے تمہاری شہرت سن کر آیا ہوں۔ تائے ابا نے انکار کرنا چاہا لیکن استاد نے اشارہ سے کہہ دیا لڑو۔ سو دونوں پہلوان اکھاڑہ میں اترے۔ وہ انگریز پلا پلایا' موٹا تازہ بھینسے کا بھینسا' تائے ابا دبلے پتلے۔ وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ کیسا پہلوان ہے۔ (Fall - Fall) یعنی گرا لینے کی شرط ٹھہری۔ کہتے ہیں جیسے ہی دونوں کے ہاتھ ملے' تائے ابا نے پہلو پر آ کر

انگیڑی لگا کر "دھوبی پاٹ" کا داؤ مارا تو انگریز پہلوان اچھل کر چھت سے جا لگا اور پھر جو نیچے گرا تو آدھا اکھاڑہ کے اندر اور آدھا باہر۔ اٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ تائے ابا نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پھر اسے بتایا کہ میں نواب پہلوان نہیں ان کا شاگرد اور خلیفہ ہوں۔ وہ اور بھی حیران ہوا۔ نواب صاحب سے کہنے لگا "ویل' پہلوان اپنے اس 'گھنٹہ گھر' کو اگر تم ولایت بھیج دو تو دنیا میں نام پائے اور لاکھوں روپیہ کما کر لائے"۔ نواب صاحب نے سمجھایا کہ "ہم پہلوانی شوق کو کرتے ہیں' پیسہ کمانے کو نہیں کرتے"۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے تائے ابا لاہور آ گئے تھے۔ کیمپ کے مصائب اور راستہ کی مشکلات کی وجہ سے دمہ کا شدید حملہ ہوا۔ میو ہسپتال میں کچھ عرصہ داخل رہے اور وہیں انتقال کیا۔ ایسی بے سروسامانی کا عالم تھا کہ بمشکل جنازہ میانی صاحب تک پہنچایا جا سکا' کندھا دینے والے بھی نہ تھے۔ آج خاندان میں کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں تھی کہ دو بول فاتحہ ہی کے کوئی جا کر پڑھ لے۔ شاید انہیں اس کی حاجت بھی نہیں۔ جتنا قرآن انہوں نے زندگی میں پڑھا اور پڑھایا ایسی سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہوگی۔ ایک منزل روز پڑھنا ان کا عمر بھر معمول رہا۔ نہایت سادہ مزاج اور سادہ دل بزرگ تھے۔ ہمیشہ لٹھے یا گاڑھے کا پاجامہ اور ململ کا کرتا پہنتے تھے۔ شدید سردی میں گاڑھے کی مرزائی یا صدری پہن لیتے تھے۔ کھانے میں بھی ایسی سادگی تھی اور میل جول میں ازحد بے تکلف۔ بچوں کا سا بھول پن میں نے ان میں دیکھا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ آمین۔

قاری پیر عبدالرحمٰنؒ

سن پیدائش تحقیق نہ ہوسکا۔ حافظ پیر بخش سے ناظرہ قرآن پڑھا' پھر حضرت شیخ الشیوخ قاری نجیب اللہ سے مشق کی۔ اس کے بعد میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے مشق کی اور سبعہ قرأت پڑھیں۔ مشاق اور ماہر تھے۔ طلباء کی تربیت اور تعلیم کی خاص مہارت تھی۔ قاری صاحب ممدوح نے آپ کو خان پور' تحصیل کھڑڑ ضلع انبالہ کے مدرسہ قرآن میں مدرس مقرر کرا دیا تھا۔ وہیں تعلیم میں مصروف رہے اور بکثرت طلباء نے آپ سے قرآن پڑھا۔

حافظ قاری اللہ دیا راجپوتؒ

سن پیدائش تحقیق نہ ہوسکا۔ قرآن مختلف مکاتب میں پڑھا۔ یادداشت بڑی زبردست تھی۔ ابتداء" جلد پڑھنے والوں اور غلط خوانوں میں مشہور تھے۔ جوانی میں صحیح کرنے اور تجوید سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیؒ سے مشق کی اور ممدوح کو پے در پے سنایا۔ پھر حضرت شیخ الشیوخ مولانا محدثؒ کو تمام قرآن سنایا اور بہترین مشاق بن گئے۔ آواز پست تھی۔ حدر (تیز رفتاری) کے ساتھ قرآن پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ جب تک جسم میں قوت رہی تمام قرآن دو رکعتوں میں برعایت اصول تجوید پڑھ لیتے تھے۔ کمزوری اور امراض کے زمانہ میں بھی ایک دو منزلیں پڑھنے سے باک نہ تھا۔ تمام عمر خدمتِ قرآن میں صرف کی۔ جامع مسجد کے مدرسہ میں آخر تک پڑھاتے رہے۔

سبعہ کا شوق ہوا تو میرے شیخ سے شاطبیہ یاد کی اور پھر بعض روایات سنائیں مگر پوری نہ کر سکے۔ بواسیر کی عرصہ سے شکایت رہتی تھی' رفتہ رفتہ طاقت سلب ہوگئی اور ۱۹۱۵ء ۱۳۳۳ھ میں انتقال کیا۔

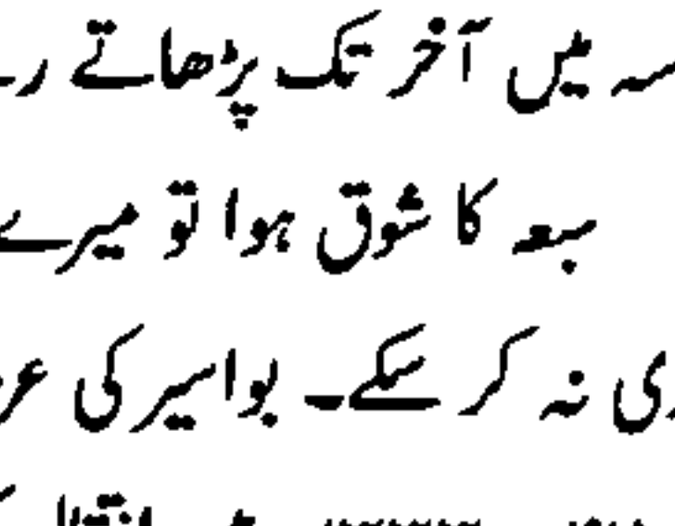

قاری حافظ سید محتشمؒ

۱۸۸۱ء ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالرحمٰن ڈبل سے قرآن پڑھا اور اردو، فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد میرے شیخ قاری عبدالرحمٰن اعمیٰؒ سے سبعہ قرأت پڑھیں۔ عرصہ تک دلی میں بچوں کو قرآن اور فارسی پڑھانے پر ملازم رہے۔ رمضان میں پانی پت آ جاتے تھے۔